ثقافت

خلیفہ

عبدالحکیم

نمبر

جون - جولائی ۱۹۶۰ء

۴۸۶

بلغ العلیٰ بکمالہٖ
کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ
صلوا علیہ وآلہٖ

(سعدیؒ)

پہنچا بلندیوں پہ وُہ اپنے کمال سے
ناپید ظلمتیں ہوئیں اُس کے جمال سے!
حُسنِ صفات ختم ہے اُس خُوش خِصال پر
صلوٰۃ اُس کی ذات پر اور اُس کی آل پر!

(حکیمؔ)

خلیفہ عبدالحکیم

ثقافت لاہور

مؤسس ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم مرحوم

جون۔ جولائی سنہ ۱۹۶۰ء

جلد ۸ شمارہ ۶-۷

خلیفہ عبد الحکیم نمبر

سالانہ چندہ
آٹھ روپے

فی پرچہ
ایک روپیہ آٹھ آنے

ادارۂ ثقافت اسلامیہ
کلب روڈ۔ لاہور

مطبوعات ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ ۱۹۵۰ء میں اس غرض سے قائم کیا گیا تھا کہ دورِ حاضر کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اسلامی فکر و خیال کی از سرِ نو تشکیل کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ اسلام کے بنیادی اصولوں کو موجودہ حالات پر کس طرح منطبق کیا جا سکتا ہے۔ یہ ادارہ اسلام کا ایک عالمگیر، ترقی پذیر اور معقول نقطۂ نگاہ پیش کرتا ہے۔ تاکہ ایک طرف جدید مادہ پرستانہ رجحانات کا مقابلہ کیا جا سکے جو خدا کے انکار پر مبنی ہونے کی وجہ سے اسلام کے روحانی تصورِ حیات کی عین ضد ہیں، اور دوسری طرف اس مذہبی تنگ نظری کا ازالہ کیا جائے جس نے اسلامی قوانین کے زمانی اور مکانی عناصر و تفصیلات کو بھی دین قرار دے دیا ہے۔ اور جس کا انجام یہ ہوا کہ اسلام ایک متحرک دین کے بجائے ایک جامد مذہب بن گیا۔ اس ادارہ کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اسلام ایک ارتقاء پذیر تصورِ حیات ہے جس کی بنیادیں اٹل اور ناقابلِ تغیر ہیں لیکن جس کے تفصیلی قوانین میں بلحاظ حالات ترمیم و تبدیلی ہو سکتی ہے بشرطیکہ ایسی ترمیمات اور تبدیلیاں انہی اصولوں پر مبنی ہوں جو بنیادِ اسلام ہیں۔ اس طرح یہ ادارہ دین کے اساسی تصورات اور کلیات کو محفوظ رکھتے ہوئے ایک ایسے ترقی پذیر اسلامی معاشرہ کا خاکہ پیش کرتا ہے جس میں ارتقائے حیات کی پوری پوری گنجائش موجود ہو اور یہ ارتقاء انہی خطوط پر ہو جو اسلام کے متعین کردہ ہیں۔

اس ادارہ میں کئی ممتاز اہلِ قلم اور محققین تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول ہیں جو زندگی کے مختلف مسائل پر اسلامی نقطۂ نظر سے غور و فکر کرتے ہیں۔ ان حضرات کی لکھی ہوئی جو کتابیں ادارہ سے شائع کی گئی ہیں اُن سے مسلمانوں کے علمی اور تمدنی کارنامے منظرِ عام پر آ گئے ہیں اور اسلامی لٹریچر میں نہایت مفید اور خیال آفرین مطبوعات کا اضافہ ہوا ہے۔ ادارہ کی ان مطبوعات کو علمی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا ہے۔ اور پاکستان کے صوبوں اور مرکز کے تعلیمی ادارے بھی ان مطبوعات کی اہمیت اور افادیت کو محسوس کرتے ہوئے ادارے کی معاونت فرما رہے ہیں۔ ادارے نے مطبوعات کی ایک ایسی فہرست شائع کی ہے جس میں کتابوں کے متعلق تعارفی نوٹ بھی درج ہیں تاکہ ان کی اہمیت و افادیت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ یہ فہرست اور ادارہ کی مطبوعات مندرجہ ذیل پتہ سے دستیاب ہو سکتی ہیں:

سیکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور

ترتیب

طابع ناشر	مطبوعہ	مقام اشاعت
شاہد حسین رزاقی	انجمن حمایت اسلام پریس لاہور	کلب روڈ۔ لاہور

شاہد حسین رزاقی

تاثرات

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی شخصیت میں کچھ ایسی دلکشی اور جاذبیت تھی، ان کے اوصافِ حمیدہ نے ان کو اس قدر ہر دلعزیز بنا دیا تھا، ادارہ کا ہر رکن ذاتی طور سے بھی ان سے اتنا زیادہ قریب تھا اور وہ ذہنی و فکری اعتبار سے ہم سب ان سے اس حد تک متاثر ہوئے ہیں کہ ہمارے دلوں میں ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہتی ہے اور ہم ان کی کمی کو ہر ہر قدم پر محسوس کرتے ہیں۔ یوں تو یہ ادارہ اور "ثقافت" کا ہر شمارہ اپنے موسسں کی یاد تازہ کرنے کے لیے کافی ہے اور اس کے لیے کوئی خاص نمبر نکالنے کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی لیکن مرحوم سے اپنی عقیدت ظاہر کرنے اور ان کے متعلق مختلف ممالک کے ممتاز مفکروں کے تاثرات پیش کرنے کی غرض سے ہم نے یہ خصوصی شمارہ مرتب کیا ہے۔ اور ہم کوشش کریں گے کہ آئندہ بھی ثقافت میں وقتاً فوقتاً ایسے مضامین شائع ہوتے رہیں جو مرحوم کی شخصیت اور ذاتی اوصاف کے علاوہ ان کے افکار و نظریات اور علمی و دینی خدمات پر بھی روشنی ڈال سکیں۔

خلیفہ صاحب مرحوم کی زندگی کو تین اہم حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور طالب علمی کا زمانہ ہے جو اسلامیہ ہائی اسکول سے شروع ہو کر ایم۔ اے۔ او کالج علیگڈھ اور سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں اعلیٰ تعلیم کی تکمیل پر ختم ہوا۔ اس زمانہ میں خلیفہ صاحب ایک ذہین طالب علم، سحر بیان مقرر اور خوش گو شاعر کی حیثیت سے دوسرے تمام طلبا سے ممتاز رہے جس کا اندازہ اس شمارہ میں خلیفہ صاحب کے بعض پرانے دوستوں کے مضامین سے ہو سکتا ہے۔ دوسرا دور جامعہ عثمانیہ (حیدر آباد دکن) میں فلسفہ کی پروفیسری سے شروع ہوا اور تیس سال سے زیادہ جاری رہا۔ اسی زمانے میں خلیفہ صاحب جرمنی گئے اور ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے فلسفہ میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ یہ زمانہ علمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ بڑے سکون و اطمینان اور دلچسپیوں کا دور تھا اور خلیفہ صاحب بھی اس زمانہ کو اپنی زندگی کا خوشگوار ترین دور کہا کرتے تھے۔ پیشِ نظر شمارہ میں اس دور سے متعلق مضامین سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ زمانہ واقعی کس قدر قابلِ رشک تھا۔ خلیفہ صاحب کی زندگی کا تیسرا اور آخری دور پاکستان بننے کے بعد شروع ہوا اور یہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی ڈائرکٹری کا زمانہ ہے۔ مرحوم کے لیے یہ ادارہ ایک مقصدِ حیات کا درجہ رکھتا تھا اور زندگی کے آخری دس گیارہ سال انہوں نے اسی ادارہ کے لیے وقف کر دیئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ ان کی زندگی کا اہم ترین

دور تھا۔ اسی زمانے میں ان کے قلم کے جوہر کھلے۔ اور انہوں نے ایسی کتابیں اور مقالے لکھے جو جدید مسلم افکار کی تاریخ میں ایک روشن ترین باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خلیفہ صاحب مرحوم کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی افکار کی ازسرِنو تشکیل کر کے اسلام کی اساسی قدروں اور عصری تقاضوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ اور اسلام کے عالمگیر اور ترقی پذیر اصول ساری دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیے جائیں کہ اسلام ایک ساکن و جامد مذہب کے بجائے ایک متحرک دین اور حیات بخش قوت ثابت ہو۔ اسی مقصد کو انہوں نے اپنی تحریروں میں ملحوظ رکھا اور اسی مقصد کے لیے انہوں نے اپنی سحر بیانی سے بھی پورا کام لیا۔ ان کی تحریر و تقریر دونوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ اسلام کی حقیقی اور اعلیٰ تعبیریں پیش کریں۔ چنانچہ انہوں نے مختلف ممالک میں مذہبی اور علمی مباحثوں میں بھی حصہ لیا۔ اور امریکہ، لبنان، سیلون، اور آسٹریلیا کے وسیع دورے کر کے اسلام کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں دُور کیں۔ ان دوروں کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اہل کلیسا کی تنگ نظری اور صلیبی جنگوں کی وجہ سے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ایک دوسرے کے مذہب کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ رفع کر دی جائیں تاکہ خدا پرست مذاہب باہم مفاہمت اور رواداری سے کام لیں اور مادیت اور الحاد کی قوتوں کا متحدہ طور پر مقابلہ کر سکیں۔ خلیفہ صاحب کو اپنے ان تمام مقاصد میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ اور دنیا کے بعض نہایت ممتاز عالموں، مفکروں اور محققوں نے خلیفہ صاحب کے متعلق اپنے تاثرات میں ان کے علم و فضل، ان کی عظمتِ فکر اور ان کے مقصد کی صداقت کا جس طرح اعتراف کیا ہے وہ مرحوم کی زندگی کے اس دور کی اہمیت اور افادیت کا ایک بہترین ثبوت ہے۔ پیش نظر شمارہ میں یہ تاثرات یکجا کر دیے گئے ہیں اور مختلف مضامین کے مطالعے سے خلیفہ صاحب کی زندگی کے مختلف پہلو واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں۔

اس شمارہ کے مضمون نگار

خلیفہ نمبر میں ان لوگوں کے مضامین اور تاثرات شائع کیے گئے ہیں جو خلیفہ صاحب سے ذاتی طور پر خوب واقف تھے۔ ان میں مرحوم کے قریبی رشتہ دار بھی ہیں اور پرانے دوست بھی اور وہ غیر ملکی احباب بھی جو امریکہ کے طویل دوروں، حمدون کی مسلم مسیحی مؤتمر، اور لاہور کی اسلامی مجلسِ مذاکرہ میں ان سے بخوبی واقف ہوئے۔ ان کا بہت مختصر سا تعارف درج ذیل ہے:

جناب اختر حسین صاحب ترقیات و اطلاعات کے وزیر ہیں۔ جب خلیفہ صاحب کا انتقال ہوا تو اختر حسین صاحب مغربی پاکستان کے گورنر تھے اور انہوں نے ادارہ کے نام یہ تعزیتی پیام ارسال فرمایا تھا۔

جناب حبیب الرحمٰن صاحب پاکستان کے وزیر تعلیم ہیں۔ انہوں نے خلیفہ صاحب کی وفات پر جن تاثرات کا اظہار فرمایا تھا

وہ شائع کیے جا رہے ہیں۔

جناب محمد ظفر اللہ خاں بین الاقوامی عدالت کے نائب صدر ہیں۔ پہلے پاکستان کے وزیر خارجہ تھے۔ خلیفہ صاحب مرحوم سے ان کی دوستی اس وقت ہوئی جب دونوں کالج میں پڑھتے تھے۔

ڈاکٹر فان گرون بام ایک نامور مورخ اور مصنف ہیں۔ کیلی فورنیا یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر اور نیر ایسٹ سنٹر کے ڈائرکٹر ہیں۔

ڈاکٹر ہرسٹ آر اینڈرسن امریکہ کے ایک ممتاز فاضل اور واشنگٹن کی امریکن یونیورسٹی کے صدر ہیں۔

ڈاکٹر جوزف شاخت ایک مشہور و معروف مستشرق اور نامور محقق ہیں۔ ہالینڈ کی لائڈن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں۔

ڈاکٹر برنارڈ لیوس برطانیہ کے ایک مشہور تاریخ دان اور مصنف ہیں۔ لندن یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہیں۔

ڈاکٹر لوئی ماریسینو فرانس کے ایک ممتاز ترین فاضل ہیں۔ پیرس یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ مسلم۔ مسیحی تعاون کمیٹی کی مرکزی عاملہ کے رکن ہیں۔

ڈاکٹر صادق رضازادہ شفق ایران کے مشہور عالم فلسفی اور مصنف ہیں۔ تہران یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر ہیں۔

ڈاکٹر ایرک بیتھمن واشنگٹن میں امریکن فرائنڈز آف دی مڈل ایسٹ کے تحقیقاتی شعبہ کے ڈائرکٹر اور مسلم۔ مسیحی تعاون کمیٹی کی مستقل مجلس کے رکن ہیں۔

شیخ علی کاشف الغطاء عراق کے ایک سربرآوردہ عالم اور مجتہد ہیں۔ حمدون کی موتمر میں خلیفہ صاحب کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔

ڈاکٹر عزیز۔ ایس عطیہ سالٹ لیک سٹی، امریکہ میں یوٹا یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات و ثقافتی مرکز میں سینئر پروفیسر ہیں۔

مسٹر فری لینڈ کے۔ ایبٹ ایک امریکی محقق ہیں جو ہندوستان و پاکستان میں اسلامی تحریکات کا مطالعہ کرنے کے لیے لاہور میں مقیم ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں اردو کے پروفیسر تھے۔ ایک ممتاز ترین ادبی شخصیت اور ملک گیر شہرت کے مالک ہیں۔

پروفیسر ایم۔ ایم شریف پاکستان کے ایک ممتاز فلسفی ہیں۔ علی گڈھ میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ اب ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور کے ڈائرکٹر ہیں۔

پروفیسر قاضی محمد اسلم کراچی یونیورسٹی میں فلسفہ اور نفسیات کے پروفیسر ہیں۔

جناب عبدالرحمٰن چغتائی پاکستان کے نامور مصور ہیں۔ خلیفہ صاحب کے بچپن کے دوست اور ہم محلہ تھے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ پاکستان کے ایک ممتاز ترین فاضل اور مصنف ہیں۔ اورنٹیل کالج لاہور کے پرنسپل ہیں۔

پروفیسر حمید احمد خاں اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل ہیں۔ خلیفہ صاحب کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ ان کے یہ تاثرات ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر کیے گئے تھے۔

جناب بشیر احمد ڈار ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے رفیق، مجلۂ اقبال کے نائب مدیر اور مصنف ہیں۔

جناب ہارون خاں شروانی ہندوستان کے نامور تاریخ داں، محقق اور مصنف ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ

کے صدر اور نظام کالج حیدر آباد اور اینگلو عربک کالج دہلی کے پرنسپل تھے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے پرو وائس چانسلر ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ کے صدر تھے۔ اردو اور انگریزی میں متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔

ڈاکٹر انور اقبال قریشی پاکستان کے مشہور ماہر معاشیات ہیں عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ معاشیات کے صدر تھے۔

ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی ایران میں پاکستانی سفارت خانہ کے ثقافتی مشیر ہیں۔ تہران کے علمی و ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہیں

بیگم خدیجہ حکیم خلیفہ صاحب مرحوم کی رفیقۂ حیات ہیں۔ اس شمارہ کے لیے اپنے نامور شوہر کے کچھ حالات قلمبند کیے ہیں۔

ڈاکٹر ملکینہ کاظمی ایران کی ایک مشہور علم دوست اور روشن خیال خاتون ہیں جنہوں نے خلیفہ صاحب کی دعوت پر ۱۹۵۷ء میں مغربی پاکستان کا دورہ کیا تھا۔ ڈاکٹر کاظمی تہران کی پاکستان ایران ثقافتی انجمن کی بانی ہیں۔

بیگم رفیعہ حسن خلیفہ صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ سندھ یونیورسٹی میں نفسیات کی پروفیسر ہیں۔

بیگم جہاں آرا شاہنواز پاکستان کی ایک نہایت ممتاز اور نامور خاتون ہیں جنہوں نے ملی تحریکوں اور معاشرتی اصلاح کے کاموں میں ہمیشہ نمایاں حصہ لیا ہے۔

جناب رئیس احمد جعفری ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے رفیق اور ایک مشہور و معروف مصنف ہیں۔

پروفیسر شیخ محمود احمد آزاد کشمیر میں گورنمنٹ کالج راولاکوٹ کے پرنسپل ہیں۔

مولانا محمد حنیف ندوی ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے رفیق اور ایک ممتاز عالم اور مصنف ہیں۔

پروفیسر مظہر الدین صدیقی پہلے ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ تھے۔ اب سندھ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہیں متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔

مولانا محمد جعفر پھلواروی ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے رفیق اور ایک روشن خیال عالم اور فقیہ ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید پنجاب یونیورسٹی میں صحافت کے پروفیسر اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

جناب محمد وارث کامل لاہور کے ایک صحافی اور مصنف ہیں۔

مذکورۂ بالا اصحاب میں سے ڈاکٹر گرون باصم، ڈاکٹر شاخت، ڈاکٹر مارسینو، ڈاکٹر لیوس اور ڈاکٹر شفق بین الاقوامی اسلامی مجلسِ مذاکرہ میں شرکت کے لیے دسمبر ۱۹۵۷ء میں لاہور بھی آئے تھے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

ایمان کیا ہے؟

یہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب مرحوم کا آخری مضمون ہے جو انہوں نے وفات سے ایک ہفتہ قبل ثقافت کے لیے لکھا افسوس ہے کہ اس کی دوسری قسط مکمل نہ ہو سکی یہ مضمون لکھنے سے قبل انہوں نے کچھ عنوانات قلمبند کیے تھے جن سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس مقالہ میں کیا کچھ لکھنا چاہتے تھے۔ عنوانات کی یہ فہرست مضمون کے آخر میں درج کر دی گئی ہے۔

انسان کی گوناگوں منطقی، غیر منطقی اور نفسیاتی تعریفیں کی گئی ہیں۔ ایک عام تعریف جو منطق کی کتابوں میں ملتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان حیوانِ ناطق ہے۔ نطق میں گویائی بھی داخل ہے اور عقل بھی۔ عام طور پر اس کے معنی عقل والا حیوان لئے جاتے ہیں لیکن انسان کی زندگی میں غیر عقلی عناصر اور محرکات اتنے کثیر اور شدید ہیں کہ اب جدید نفسیات اس کو حیوانِ عاقل کہنے سے گریز کرتی ہے اور یہ تعلیم دینے لگی ہے کہ انسان وہ حیوان ہے جو اپنی جبلی خواہشوں اور غیر شعوری میلانات کو عقل و استدلال کا لباس پہنا کر اپنے افعال کو عاقلانہ ثابت کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حرکت کوئی اور حیوان نہیں کرتا۔ اس لیے یہ انسان کی امتیازی خصوصیت ہے۔ انسان کی اور بھی بہت سی امتیازی خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں جو اور حیوانوں میں نہیں پائی جاتیں مثلاً یہ کہ انسان ہنسنے والا حیوان ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انسان رونے والا حیوان ہے کیونکہ دوسرا کوئی حیوان نہ ہنستا ہے نہ روتا ہے۔ انسان کی ایک تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ آگے اور پیچھے دیکھنے والا جانور ہے۔ حافظہ انسان کے ماضی کو عالم شعور میں حال بنا دیتا ہے اور اس کے اکثر افکار و افعال کا رخ قریب یا بعید مستقبل کی طرف ہوتا ہے۔ زندگی اپنے ادنیٰ مظاہر میں بھی یہاں تک کہ نباتی اور حشراتی دور میں بھی مقصد کوش ہے لیکن انسانیت کی سطح سے نیچے یہ مقصد غیر شعوری ہوتا ہے جیسا کہ درخت کی شاخیں نور و نارِ آفتاب کی جویا ہو کر یا بلند ہوتی ہیں یا اپنا رخ بدلتی ہیں۔ جانوروں کی حیرت انگیز اعمال مقصد کوشی بھی زیادہ تر جبلی اور غیر شعوری ہوتی ہے لیکن مستقبل کا کوئی تصوری نقشہ سامنے رکھ کر اس کی طرف کوشش کی راہوں کو موڑنا انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

انسان کی ایک اور تعریف بھی ہو سکتی ہے جو کہیں میری نظر سے نہیں گزری لیکن میرے ذہن میں اکثر گزری ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان پرستش کرنے والا حیوان ہے۔ کسی اور حیوان میں یہ جبلت دکھائی نہیں دیتی۔ وحشت کے ادنیٰ ترین ادوار سے لے کر تہذیب و تمدن کی حیرت انگیز بلندیوں تک ہم اسے کسی نہ کسی چیز یا مخلوق کی پوجا ہی کرتے دیکھتے ہیں۔ وہ

کبھی موجود کی پوجا کرتا ہے اور کبھی موہوم کو تصور میں موجود بنا کر پوجتا ہے۔ انسان اپنی تمام زندگی میں بیم و رجا کا شکار رہتا ہے کبھی وہ طبیعی فطرت کے مظاہر سے خائف ہو کر ان کے شر سے بچنے کی کوشش میں ان کی پوجا کرتا ہے اور کبھی خواہشیں اور امیدیں اس کے لیے معبود تراشتی ہیں۔ اس سے کسی قدر ملتی جلتی انسان کی ایک یہ تعریف بھی ہو سکتی ہے کہ انسان صاحب ایمان ہستی ہے۔ انسان کی یہ تعریف بھی کہیں نظر سے نہیں گزری مگر ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تعریف بھی اس کی اساسی فطرت کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔ یہ خیال کسی قدر وضاحت طلب ہے۔

ایمان کا ایک صحیح اور سادہ مفہوم یہ ہے کہ کسی ایسی حقیقت کو سچ ماننا جو نہ صرف کسی فرد کے انفرادی تجربے سے متجاوز اور اس کے محسوسات سے ماورا ہو بلکہ اجتماعی طور پر وہ حقیقت کسی کا حسی تجربہ نہ ہو۔ مختصراً یوں کہیئے کہ ایمان کے مفہوم میں لازماً یہ امر داخل ہے کہ ایمان کسی قسم کا بھی ہو وہ ایمان بالغیب ہوتا ہے۔ انسان صرف آگے پیچھے دیکھنے والا حیوان ہی نہیں بلکہ ماورائے تجربہ حقائق کو تسلیم کرنے والا حیوان ہے۔ طرح طرح کے معبود بھی وہ اسی جذبۂ ایمانی کی وجہ سے تراشتا ہے اور طرح طرح کے مقاصد و غایات و نصب العین بھی وہ اسی میلان کی بدولت بناتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ محض حاضر سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا اور کسی ایسی صورتِ حال کا آرزومند رہتا ہے جو ابھی پردۂ غیب اور کتمِ عدم میں ہے لیکن یہ آرزو اس کو کبھی سہارا نہ دے سکے اگر اس کے متحقق ہونے کا یقین اس کے ساتھ وابستہ نہ ہو۔ انسان ایسی آرزوؤں کے صورت پذیر ہونے پر بھی ایمان لاتا ہے جن کے پورا ہونے کے لیے کوئی اسباب موجودہ حالت میں دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن انسانی ارتقا کی تمام تاریخ اس کی شاہد ہے کہ اسباب ایمان پر مقدم نہ تھے بلکہ ایمان کے استقلال اور اس کی استواری نے اسباب مہیا کر دیئے۔ اس لحاظ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایمان ایک تخلیقی قوت ہے۔

ہم نے انسان ہی کو صاحبِ ایمان ہستی کہا ہے لیکن اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ حیوانی زندگی میں بھی ادنےٰ سے اعلےٰ کی طرف ارتقا ایمان ہی کی بدولت ہوا ہے۔ زندگی کبھی مادی اسباب و آلات سے پابزنجیر اور میکانکی علت و معلول کے زنداں میں اسیر نہیں رہی۔ حیاتیات میں جن حکماء نے ارتقاء کا نظریہ پیش کیا ہے ان میں سے بعض اس کے قائل ہیں کہ حشرات و چرند و پرند میں بھی ارتقائے حیات نے جو انقلابی قدم اٹھائے ہیں ان کی وجہ بعض خارجی اسباب کا جمع ہونا یا ماحول کی فیاضی نہ تھی بلکہ اس امر پر غیر شعوری ایمان تھا کہ بلند تر زندگی ممکن الوجود ہے۔ اسلامی تاریخ میں ارتقائے حیات کے مبلغوں میں سب سے بڑھ کر عارفِ رومی ہیں جنہوں نے وضاحت کے ساتھ یہ نظریہ پیش کیا کہ زندگی کسی مرحلے میں بھی قالب کی پیداوار نہیں ہوتی بلکہ روحِ حیات خود قالب آفریں ہے۔ ع قالب از ما ہست شد نے ما ازو۔ بلند اور بہتر زندگی پر ایمان جانوں میں قوتِ خلاقی پیدا کرتا اور آرزوئے مستور کو سطحِ ظہور پر لاتا ہے۔ مادّے سے انسان تک جو قوت زندگی کو اوپر ابھارتی چلی آئی ہے اسے وہ عشق کہتے ہیں۔ یہی عشق وجدانِ حیات

بھی ہے اور ایمانِ حیات بھی۔ مادّے کو حیاتِ نباتی کا کچھ تجربہ نہ تھا لیکن اس کا جذبۂ ارتقا ایمان آفرین تھا کہ بلند تر ہستی سے رابطہ پیدا کر کے میں وہ کچھ ہو سکتا ہوں جو ابھی میرے وہم و گمان میں نہیں آتا لیکن ایسا ہونا یقینی ہے مولانا روم نردبانِ حیات پر پایہ بہ پایہ چڑھتی ہوئی زندگی کو دیکھتے ہوئے یہ ایمان رکھتے ہیں کہ ع آنچہ اندر وہم ناید آں شوم جس ہستی نے بھی حیاتِ حاضرہ کو اپنی منزل سمجھ لیا اور آئندہ کے ناقابلِ بیان ممکنات کو موجود بنانے پر یقین نہ کیا ایمان کی کمزوری کی وجہ سے اس کی ترقی رک گئی۔ عارفِ رومی نے کئی مرتبہ اس ایقان کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ انسان بھی ایک عبوری مخلوق ہے یا حیوانیت اور فوق الانسان کی طرف عبور کرنے کے لیے ایک پُل ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ ہمیں تو یہ فوق الانسان نہ کہیں نظر آتا ہے اور نہ اس کا کوئی تصور ہمارے ذہن میں آسکتا ہے تو اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ موجودہ انسانی زندگی میں جو صورتِ حیات ابھی متحقق نہیں مجھے اس کی آرزو ہے اور اس کے متحقق ہونے پر ایمان رکھتا ہوں :

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزو ست
ایں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستمِ یزدانم آرزو ست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزو ست

مولانا نے کئی جگہ اس کی تشریح کی ہے کہ زندگی کی وسیع تر اور بلند تر سطح کا کوئی واضح تصور اس بلند تر سطح پر پہنچے کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ اس کی ایک مثال عارفِ رومی نے یہ دی ہے کہ رحم کے اندر اگر جنین محض اپنے موجودہ تجربۂ حیات سے استدلال کرے تو اس کے لیے اس حقیقت کا قائل ہونا محال ہو کہ شکمِ مادر سے باہر ایک عظیم الشان عالم اور لامحدود گونا گوں کی دنیا ہے جس کے مقابلے میں مَیں موجودہ حالت میں ایک تنگ و تاریک زنداں میں مقید ہوں۔ نو مہینے اسی زنداں میں بسر کر چکنے کے بعد وہ کسی تجربے اور استدلال کی بدولت باہر نہیں آتا بلکہ زندگی کی وسعت کوشی کا ایک ایمانِ مضمر اس کو وسیع تر عالم میں لے آتا ہے جہاں پہنچ کر تجربہ اس غیر شعوری ایمان کی تصدیق کرتا ہے۔ اس سے مولانا یہ استدلال کرتے ہیں کہ یہ زمان و مکان کا عالم، یہ عالمِ رنگ و بو، یہ جہانِ آب و گل اپنی وسعتوں، رنگینیوں اور دلآویزیوں کے باوجود ایک رحم ہے جس کے اندر انسانی جانیں پرورش پاتی ہیں لیکن یہ ٹھہرنے کا مقام نہیں سرائے سرِ راہگذار ہے۔ منزلِ مقصود نہیں۔ محض استدلال سے اس سے بالاتر عالم کا نہ ثبوت مل سکتا ہے اور نہ کوئی تصور حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن انسانی روح کے اندر یہ ایمان مضمر ہے کہ حیاتِ لامتناہی کو نہ زمان و مکان مقید کر سکتے ہیں اور نہ مظاہر کی علت و معلول کی زنجیریں۔ زمان و مکان کی ماہیت پر غور کرنے والا نفس خود اس زنداں میں محبوس نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم نے اسی حقیقت کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا ہے کہ اے معشرِ جن و انس تم ان حدود و قیود سے باہر نہیں نکل سکتے :

یٰمعشر الجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السمٰوٰت والارض فانفذوا، لا تنفذون الا بسلطان ۔ — یعنی گروہ جن و انس اگر تم میں یہ سکت ہے کہ تم آسمانوں اور زمین کے حدود سے باہر نکل جاؤ تو یہ کوشش بھی کر دیکھو۔ تم کسی "سلطان" کے بغیر باہر جا ہی نہیں سکتے۔

یہ قوت یہ سلطان قید شکن وہی چیز ہے جسے ایمان کہتے ہیں۔ اسی سلطانِ ایمان کی بدولت قیودِ جمادی سے نکل کر حیاتِ نباتی میں داخل ہوتی ہے جہاں گِل مبدل بہ گُل ہوتی ہے۔ مٹی محض اپنی جمادی قوت سے کبھی گل نہ بن سکتی اگر مٹی محض مادی اسباب کے مہیا کرنے میں لگی رہتی اور اس کے اندر ممکن کو موجود کرنے کا ایمان اور میلان نہ ہوتا تو ابدالآباد تک جماد جماد ہی رہتا۔ اس جمود سے نکالنے والی قوت مٹی کا وہ ایمان ہے جس نے فقط موجودہ اسباب پر قناعت نہیں کی بلکہ بلند تر زندگی کے لیے اسباب و آلات و حالات پیدا کئے۔ اس نظریۂ حیات کے وہ حکما بھی قائل ہیں جنہوں نے زمانۂ حال میں انیسویں صدی کی گمراہ کن مادیت اور میکانیت کی تردید کر کے روحِ انسانی کے لیے آزادی کی راہیں کھولیں۔ اتفاقی طور پر وظائفِ اعضا کی تبدیلیوں سے جگنو نے اپنا چراغ نہیں جلایا بلکہ تاریکی شب میں راستہ ڈھونڈنے کی تمنا کی شدت نے یہ برقی بیٹری کرمک بے مایہ کے اندر پیدا کر دی سمندر کی تاریکیوں میں بھی کئی مچھلیاں خود اپنے نور کی روشنی میں اپنی زندگی کا کاروبار کرتی ہیں۔ علامہ اقبال انسان کو خودداری کی تعلیم دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

تا کجا طُور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم — اپنی مٹی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

یہ کام وہی ہے جو چمن کے جگنو اور سمندر کی بعض مچھلیاں انسان سے بہت پہلے کر چکی ہیں اور اس اشرف المخلوقات کے لیے سبق آموز ہیں۔ اس خیال کو کہ زندگی حالات اور آلات کی محتاج نہیں بلکہ خود ان کی آفرینش کرتی ہے حکیم ملت نے کس عمدگی سے اس شعر میں ادا کیا ہے

کبک پا از شوخیِ رفتار یافت — بلبل از ذوقِ نوا منقار یافت

بلبل کی منقار اور اس کے گلے کے ساز نے نغمہ آفرینی نہیں کی بلکہ شدتِ ذوقِ سرود نے یہ ساز مہیا کر دیا ہے۔ چکور کو ذوقِ رقص نے موزوں قسم کے پاؤں عطا کئے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ پاؤں کی خاص ساخت کی وجہ سے وہ رقص کرنے لگا ہے۔ اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان کی قوت ہی زندگی کی تخلیقی قوت ہے۔ جمادات سے لے کر انسان تک اس کا ایک ہی قانون ہے اگرچہ اس قانون کے اطلاق میں تنوع اور مسلسل بڑھتی ہوئی وسعتیں اور بلندیاں پائی جاتی ہیں

ایمان کی ماہیت ہی میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اس حقیقت کا ایقان ہے جو عالمِ شہادت کے مقابلے میں ابھی تک عالمِ غیب میں ہے۔ اس کی ضد کفر ہے جس کا مفہوم عالمِ غیب کا انکار ہے۔ قرآن کریم میں آدم و ابلیس کا قصہ درحقیقت ایمان و کفر کی تفریق کی وضاحت ہے۔ خدا نے آدم کو مٹی سے بنایا ابتدا سے آج تک جتنے

انسان ہیں وہ سب مٹی ہی کے بنے ہوئے ہیں۔ گوشت، پوست، ہڈی، خون، سب مٹی ہی کے عناصر کی مختلف صورتیں ہیں۔ تمام غذا مٹی سے پیدا ہوتی ہے۔ مٹی نبات بنتی ہے اور نبات کو حیوانات بدن کے اجزا میں تبدیل کرتے ہیں۔ انسان جب سبزی کھاتا ہے یا گوشت کھاتا ہے تو یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ خاک کا پتلا خاک ہی کھا رہا ہے۔ اس مٹی کے بت کے اندر خلاقِ فطرت نے اپنی روحِ حیات پھونک دی نفخت فیہ من روحی جس کی بدولت لامتناہی زندگی کے ممکنات اور لامحدود قوتیں اس کے اندر مضمر ہو گئیں جس طرح کہ ایک ثمر آور درخت اپنے چھوٹے سے بیج میں مضمر ہوتا ہے۔ ملائکہ ملکاتِ حیات کی مختلف صورتوں کا نام ہے۔ ملک اور ملکہ کا لفظی مادہ ایک ہی ہے عارف رومی نے اپنے ملفوظات "فیہ ما فیہ" میں لا کر کو اس عقلِ کل کی متنوع صورتیں قرار دیا ہے جن کی بدولت حیات و کائنات کا نظم و نسق قائم ہے۔ اس کی مثال انہوں نے یہ دی ہے کہ موم سے کئی طرح کے پرندے بنا سکتے ہیں لیکن اگر ان سب کو پگھلا دیا جائے تو محض موم کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا کیونکہ ان کی صورتیں محض اعراض تھے جن کا جوہر فقط موم تھا۔ قصۂ آدم میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ملائکہ کو حکم ہوا کہ تم اس نو آفریدہ مخلوق کے آگے سرِ تسلیم خم کرو۔ خدا کے مطیع تو تم ہو ہی لیکن اب بحکم خدا اس کی بھی اطاعت کرو جس میں روحِ الٰہی پھونکی گئی ہے۔ اس مخلوق کی تقدیر یہ ہے کہ وہ اس عالمِ ارضی میں نائبِ حق ہو۔ نائبِ حق کی اطاعت حق کی اطاعت کے منافی نہیں بلکہ بحکم حق لازم ہے۔ آدم کو ذی اختیار ہستی بنانے کا ایک ناگزیر نتیجہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اس اختیار کا غلط استعمال کرے اور اسے تعمیرِ حیات کی بجائے تخریب میں صرف کرنے لگے۔ ملائکہ یا فطرت کی قوتوں کو انسان کا یہ پہلو دکھائی دیا کہ یہ فساد پیدا کرے گا اور خون ریزی کرے گا اور اس حالت میں بندۂ فرماں بردار نہ ہوگا۔ انسان کی فطرت کا یہ پہلو بھی ایک حقیقت ہے اس لیے ملائکہ کو جو کچھ اس کے اندر نظر آیا وہ بھی صحیح تھا۔ مگر غلطی اس میں یہ تھی کہ

عیبِ او جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

آدم کے علم و ہنر کے پہلو فطرتِ مجبور کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ آفرینشِ آدم کے بلیغ اشعار میں علامہ اقبال نے اس خیال کو موثر انداز میں بیان کیا ہے

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور   خودگرے خودشکنے خودنگرے پیدا شد

دورِ آدم سے قبل کائنات میں کوئی ایسی ہستی نہ تھی جسے اپنے آپ کو بنانے اور بگاڑنے کا اختیار ہو۔ بالفاظِ دیگر وہ ایک حد تک اپنی تقدیر کی معمار ہو۔ کسی مخلوق میں اپنی ذات کا شعور بھی نہ تھا۔ حسبِ ضرورت شعورِ ماحول جانداروں میں پایا جاتا تھا لیکن اس سے آگے نہ شعورِ ذات تھا اور نہ شعورِ حق۔ ابتدائی آشفتگی کے بعد فطرت کی قوتوں نے اطاعتِ آدم اس لیے قبول کر لی کہ علمِ اشیا و حوادث کی بدولت اس کا مسخرِ کائنات ہونا ان پر آشکار ہو گیا۔ تسخیرِ فطرت انسان۔

کا مخصوص وظیفہ حیات اور وجہ تکریم آدم ہے۔

فطرت کی قوتیں اس کی عظمت پر ایمان لے آئیں لیکن ابلیس کافر ہو گیا۔ اس کفر کی ماہیت بھی قرآن کے قصۂ آدم سے آشکار ہوتی ہے۔ اس قصے میں ابلیس اس مادیت کا نمائندہ ہے جس کو مادے کی ترکیبات کے اندر مادی عناصر سے زیادہ کوئی مستقل جوہر حیات نظر نہیں آتا۔ قرآن کا ابلیس مظاہر پرست ہے اس نے آدم کو فقط اسی نظر سے دیکھا کہ وہ محض مٹی کا ایک پتلا ہے۔ اس بے حقیقت مخلوق کو مسجود ملائک ہونے کا حق کہاں سے حاصل ہو گیا۔ آج بھی جو حکیم طبیعی مادیت اور میکانیت کے باطل فلسفے کا شکار ہے وہ انسان کو عناصر ارضی کا ایک اتفاقی مجموعہ و مرکب سمجھتا ہے۔ وہ اس کے اندر حیات حیوانی کے علاوہ کسی ایسی روح کا قائل نہیں جو مادی قوتوں کی پیداوار نہیں بلکہ علم و عمل کی بدولت ان کی مسخر اور نفخۂ الٰہی کی بدولت لامتناہی قوتوں کی حامل ہے۔ وہ روح کی آواز کو جسم کے ساز کی آواز سمجھتا ہے جو ساز کے ٹوٹنے پر خاموش ہو جائے گی یا چراغ بدن کے تیل کی عارضی روشنی ہے جو چراغ کے ٹوٹنے یا تیل کے ختم ہونے پر ہمیشہ کے لیے بجھ جائے گی۔ گویا بندروں کی ایک ترقی یافتہ نوع ہے جس نے بندروں سے زیادہ ذہین ہو کر بڑھتی ہوئی ضروریات کے لیے آلات بنا لئے ہیں۔ مادہ پرست کو اس کے اندر کوئی ابد قرار حیات نظر نہیں آتی۔ اکبر الٰہ آبادی نے باندازِ ظرافت کیا حکیمانہ بات کہی ہے

کہا منصور نے خدا ہوں میں ڈارون بولے بوزنہ ہوں میں
سن کے کہنے لگے مرے اک دوست فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

قرآن نے مظاہر پرستی اور مادہ پرستی ہی کو باندازِ ابلیس پیش کیا ہے جس کو تکریم آدم کے وجوہ نظر نہیں آ سکتے۔ اس کا استدلال مادہ پرستی کے اندر محصور ہے اس لیے کہ آدم بس خاک کا پتلا ہے۔ آدم کا مرئی مظہر یقیناً خاکی تھا۔ اس کے لامتناہی ممکنات پر یقین ایمان کا متقاضی تھا جو ابلیس میں پیدا نہ ہو سکا۔ اس کے معلومات سب ادراکاتِ حاضرہ کی بدولت تھے۔ حاضر سے غیب کی حقیقتوں کی طرف عبور کرنے کی صلاحیت اس میں نہ تھی۔ جس کو مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایمان سے عاری تھا۔ ابلیس ایک تمثیل ہے اس محصور و محدود نظر والے انسان کی جو زندگی کی لامتناہی سرّیت اور اس کی لامحدود ارتقائی قوتوں کا قائل نہیں۔ مادہ پرستی حاضر پرستی ہے وہ اس امر کا انکار ہے کہ ہر حالت میں غیب حاضر کے مقابلے میں وسیع تر ہے۔ مزید برآں انفس و آفاق دونوں میں غیب حاضر کے مقابلے میں کشافِ حقیقت بھی ہے اور بواسطۂ ایمان خلاقِ حیات بھی۔

قصۂ ابلیس و آدم میں اور بھی نہایت اہم اسرار حیات پنہاں ہیں۔ فقط مادیت کا قائل اور مظاہر پرست اُن تمام حقائق کی نسبت مائل بہ انکار ہوتا ہے جو اس کے ادراکِ حسی کے محدود سانچوں میں نہ ڈھل سکیں۔ طبیعی سائنس

کی ترقی نے حیات و کائنات کا جو غلط نظریہ وضع کر لیا، خود انسان کے نفسی حقائق کا بھی منکر ہو گیا کیونکہ نفس کی کوئی مستقل حقیقت مادی مظاہر کی علت و معلول کی کڑیوں میں کہیں نظر نہ آتی تھی۔ مادیت کا مدار ریاضیات پر تھا۔ اس نظریے کے مطابق ہر شے کی حقیقت ریاضیاتی تناسب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جس چیز پر ریاضی کا اطلاق نہ ہو سکے وہ محض وہم کی پیداوار ہے۔ مادیت کی بنا پر جو نفسیات لکھی گئی اس نے روح یا نفس کو خارج از بحث کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود وہ شعور بھی بے حقیقت ہو گیا جس نے یہ نظریۂ حقیقت پیدا کیا تھا۔ گویا اس خیالِ باطل کی بنا پر انسان خود اپنا منکر ہو گیا۔ مادی مظاہر کے تسلسل کا اقرار باقی رہ گیا اور اس کے علاوہ تمام حقائقِ حیات کے متعلق انکار ہی انکار۔ اس انکار منشی سے ایک چھوٹا پندار پیدا ہوا۔ مادہ پرستی میں عالم کل ہونے کے زعم نے ترقی پذیر معرفت کے دروازے بند کر دیئے۔ قرآن کریم کے ابلیس میں اسی لیے آپ کو انکار اور پندار نظر آتا ہے۔ حقائقِ نامشہود کا انکار انسان کے نفس کو محدود کر دیتا ہے۔ معرفتِ حیات کے لیے لازمی ہے کہ انسان حقیقتِ حیات کی لامحدودیت کا احساس رکھے۔ جو کچھ اب تک معلوم ہوا ہے اس کو نامعلوم کے مقابلے میں نہایت قلیل سمجھے۔ اور رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا کی مسلسل دعا اس کا وظیفہ بن جائے۔ علم کے ساتھ علم اسی زاویۂ نگاہ سے پیدا ہوتا ہے۔ افلاطون نے کہا کہ علم کی ابتدا حیرت سے ہوتی ہے۔ حیرت انسان کے اندر استفہام پیدا کرتی ہے اور پیدا شدہ سوال کے جواب کے لیے نفسِ انسانی تجسس، مشاہدے اور استدلال سے کام لیتا ہے۔ زندگی کی نسبت جس شخص کے اندر حیرت پیدا نہیں ہوتی اس کے اندر حکمت کا آغاز بھی نہیں ہوا۔ حکمتِ یونانی نے حیرت کی بدولت علم میں ترقی کے بہت سے قدم اٹھائے لیکن وہ علم میں اس فراوانی پر نہ پہنچے جو انسان کو پھر ایک نئی حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ اس نئی حیرت ہی سے نئی معرفت کا آغاز ہوتا ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ عرفی نے اس مضمون کو نہایت بلیغ انداز میں ادا کیا ہے وہ کہتا ہے کہ عوام جن باتوں کو معلوم اور واضح سمجھتے ہیں گویا ان کو جاننے میں کوئی اشکال ہی نہیں ان کے پردے میں بھی پُراسرار حقائق ہیں جن کا اندازہ چشمِ بصیرت یا عارفانہ حیرت ہی کر سکتی ہے:

ایں ہا ہمہ راز است کہ معلومِ عوام است ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ

اسی مضمون کو مرزا غالب نے اپنے انداز میں پیش کیا ہے:

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا واقف نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا

یہ عارفانہ حیرت "ایمان بالغیب" کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ احساسِ سرّیتِ حیات، احساسِ وسعتِ عالمِ غیب کا نام ہے۔ ہمارے ہاں حکیمانہ مزاج کے صوفیائے کبار نے عارفانہ حیرت ہی کو علم کا انجام قرار دیا ہے۔

عارف رومی کہتے ہیں: علم را بفروش و حیرانی بخر کیونکہ محض علم سے پندار پیدا ہوتا ہے اور حیرت سے نظر میں وسعت و اضافہ ہوتا ہے۔ عطار کا یہ قطعہ بھی نہایت درجہ عارفانہ اور حکیمانہ ہے

کاملے گفت است می باید بسے عقل و حکمت، تا شود گویا کسے

باز باید عقلِ بے حد و شمار تا شود خاموش یک حکمت شعار

مگر یہ خاموشی پھر آبستنِ حقائق ہو جاتی ہے اور اس سے ایک نئی سطح کی گویائی نمودار ہوتی ہے جس کے اندر عجز بھی ہوتا ہے اور اقرار بھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انکار و پندار ناپید ہو جاتے ہیں اور "ایمان بالغیب" سے معرفت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ کسی انسان کے اندر یہ خیال کہ میں عرفانِ حقیقت کے منتہے پر پہنچ گیا ہوں اس پر مزید ترقی کے راستے بند کر دیتا ہے اسی لیے عارفِ رومی یہ ہدایت فرماتے ہیں کہ ہستی لامتناہی ہے کسی ایک مقام کو آخری منزل سمجھ کر اس پر ڈیرہ نہ ڈال دینا

اے برادر بے نہایت درگہیست ہر چہ بر وے می رسی بر وے مایست

معرفت کوش انسان میں کبھی انکار، پندار اور استکبار پیدا نہیں ہو سکتے۔ قرآن نے انہیں صفاتِ حیات کش کو ابلیسیت قرار دیا ہے۔ ربوبیت اور الوہیت کو حیات و کائنات کی اساس سمجھنے والا ایک قسم کی لاادریت کے باوجود معرفت میں ترقی کرتا رہتا ہے۔ عقل و ادراک اور انسانی تجربات سے حاصل شدہ معلومات کو وہ کبھی حقیقتِ کلی کا مرادف نہیں سمجھتا۔ ایک عظیم الشان نبی بھی جس پر معرفت کے کئی دروازے کھولے گئے وہ بھی علی الاعلان اقرار کرتا ہے کہ ما عرفناک حق معرفتک۔ علم ہستی ہی کا ہوتا ہے۔ اگر ہستی لامتناہی ہے اور اس میں مسلسل اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ لازم آتا ہے کہ انسان کا علم کسی ایک منزل پر بھی پوری ہستی پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم نے ایک طرف ہستی کے لامحدود ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے اور دوسری طرف علم کے محدود ہونے کا احساس بھی انسان کو دلایا ہے۔ کلماتِ الٰہی جن سے آفرینش و بقائے حیات و کائنات ہے ان کے لامحدود ہونے کی نسبت فرمایا گیا کہ اگر تمام سمندر لکھنے کی روشنائی بن جائیں اور تمام جہان کے درختوں سے قلم بنائے جائیں تو بھی ان کلمات کی مکمل فہرست نہ بن سکے۔

ولو ان ما فی الارض من شجرۃ اقلام والبحر یمدہ من بعدہ سبعۃ ابحر ما نفدت کلمٰت اللہ ۳۱: ۲۷

اور اگر زمین کے سارے درخت قلم بن جائیں اور سمندر بلکہ اس کے علاوہ سات سمندر اور بھی سیاہی بن جائیں تب بھی "کلمات اللہ" ختم نہ ہوں گے۔

اور علم کی نسبت فرمایا کہ:

وما اوتیتم من العلم الّا قلیلاً (تمہیں بہت کم علم دیا گیا ہے۔)

خدا اپنے فیض سے غیب کے حقائق حسبِ سعی و توفیق اور حسبِ ضرورت اپنے خاص بندوں پر منکشف کرتا رہتا ہے۔ لیکن یہ انکشاف بھی جزئی ہوتا ہے اس لیے کوئی عارف باللہ یا نبی محترم مطلقاً عالم الغیب ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ بہت کچھ جو عوام کے لیے غیب ہوتا ہے خواص کے لیے شہود اور تجربہ بن جاتا ہے۔ لیکن خواص کے آگے ہمیشہ بہت کچھ غیب باقی رہتا ہے اس لیے ایمان بالغیب کی ضرورت وہاں بھی ہے۔

مادیت پرست اور مظاہر پرست جبری بھی ہوتا ہے اس کو طبیعی مظاہر میں ہر جگہ جبر ہی جبر دکھائی دیتا ہے۔ مادی مظاہر کی فطرت فطرتِ مجبور ہے۔ سیارے اپنے مداروں میں ریاضیاتی جبر کے ماتحت گردش کرتے ہیں۔ ہوائیں اپنی مرضی سے اپنا رُخ نہیں بدل سکتیں۔ پانی اپنی مرضی سے نشیب کی بجائے فراز کی طرف نہیں بہہ سکتا۔ مادی مظاہر کی تقدیر متعین اور اٹل ہے۔ عقل جو مظاہر فطرت سے قوانین اخذ کرتی ہے وہ بھی اس جبری فطرت کی آئینہ دار ہے اسی لیے از روئے عقل اگر اختیار کو ثابت کرنا چاہیں تو یہ کوشش کبھی بار آور نہیں ہو سکتی کیونکہ عقل کا وظیفہ ہی یہی ہے کہ وہ ایک طرف مظاہر فطرت میں اور دوسری طرف استدلال میں لزوم کی کڑیاں تلاش کرے۔ جن لوگوں نے دین کے اندر بھی محض عقلِ استدلالی سے کام لیا ہے وہ خدا کے عطا کردہ اختیار انسانی کو ثابت نہیں کر سکے اور ہمیشہ کسی نہ کسی رنگ میں جبر ہی پر پہنچے ہیں۔ چنانچہ متکلمین میں اشاعرہ اسی لیے جبری ہو گئے۔ انہوں نے عقیدۂ کسب کے پردے میں جبر کو چھپانا چاہا لیکن جبر چھپ نہ سکا۔ صحیح عقیدہ وہی مسلّمہ اسلامی عقیدہ تھا کہ الایمان بین الجبر والاختیار۔ انسان طبیعی فطرت سے مطلقاً الگ نہیں ہو سکتا اس لیے اس کے باہر اور اس کے اندر بھی جبر کے بہت سے مظاہر موجود ہیں لیکن انسان کی امتیازی خصوصیت خدا کا عطا کردہ اختیار ہے جو طبیعی فطرت کی علت و معلول کی کڑیوں سے الگ چیز ہے یہ احساس اختیار انسان کے وجدانِ حیات میں داخل ہے۔ اگر مظاہر فطرت اور مظاہر شناس حکمتِ طبیعی اس کے اقرار کے لیے دلائل مہیا نہیں کر سکتے تو اس سے اختیار باطل نہیں ہو جاتا کیونکہ زندگی مظاہر فطرت اور منطق سے وسیع تر اور عمیق تر ہے۔ زندگی کا یہی باطنی وجدانِ فطرت اور عقلِ مظاہر شناس کے مقابلے میں عالم غیب میں ہے۔ جو کچھ عالم شہود میں آجائے گا وہ جبر اور منطق و ریاضیات کی کڑیوں میں پرو دیا جائے گا۔ اسی وجہ سے مادیت والے تمام فلاسفہ جبری ہیں مگر افسوسناک بات یہ ہے کہ بعض منطق بگھارنے والے حامیانِ دین بھی جبر ہی کی تعلیم دیتے چلے آئے ہیں۔ علم الکلام کے علاوہ اس تعلیم کا اثر ہمارے بھٹکے ہوئے تصوّف پر بھی پڑا اور تصوف کے راستے سے ہماری شاعری میں بھی دخیل ہو گیا۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی　　جو چاہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا　(میر)

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں!　　سوار خاک ہیں سب بے اختیار بیٹھے ہیں　(آزاد)

فارسی متصوفانہ شاعری بھی اس خیال باطل سے لبریز ہے۔ اسلامی تعلیم اور شاعری میں اس کے خلاف شدید جہاد پہلے عارفِ رومی نے اپنی مثنوی میں کیا اور زمانۂ حال میں علامہ اقبال نے بھی نہایت زور سے جبر کے خلاف احتجاج کیا۔ قصۂ ابلیس و آدم میں ہم دیکھتے ہیں کہ آدم نے تو اپنی لغزش کا اقرار کیا کہ میں معافی کا خواستگار ہوں میں نے اپنے اختیار کو غلط برتا۔ لیکن مادیت اور اس سے وابستہ عقلیت کے مظہر ابلیس نے خلاف ورزئ حکمِ الٰہی کا الزام خود خدا پر دھرا اور کہا کہ اگر میں گمراہ ہوا ہوں تو قادرِ مطلق ہونے کی وجہ سے تو نے ہی مجھے گمراہ کیا۔ آدم اختیار کا اقرار کرتے ہوئے معافی مانگتا ہے لیکن ابلیس اپنی مادیت کی وجہ سے جبر کی پناہ لیتا ہے۔

فہرست عنوانات

ایمان یقین بے دلیل کا نام ہے۔

ہر ایمان، ایمان بالغیب ہے۔ جو کچھ ابھی تجربے میں یا معرضِ شہود میں نہیں آیا اس کی حقیقت کا یقین۔ امید کا طبعی میلان جو انسان میں موجود ہے اس کا نام ایمان ہے۔ دنیا بہ امید قائم عام محاورہ ہے اور ایمان آخرت بہ امید قائم محض ممکنات کی نسبت احتمالِ ضعیف یا احتمالِ قوی ہو سکتا ہے مگر اس کو ظنی فلسفہ کہہ سکتے ہیں ایمان نہیں کہہ سکتے محض نقل یا سند کی بنا پر کچھ یقین کر لینے کا نام ایمان نہیں۔ رسول کریمؐ نے بھی محض دوسرے انبیاء کو سند قرار دے کر ایمان حاصل نہیں کیا۔ بعض اکابر انبیاء کی تعلیم سے وہ قبل وحیِ قرآن بھی آگاہ تھے۔ مگر اس دور کی نسبت قرآن کہتا ہے کہ تم کو یہ تک معلوم نہ تھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں۔

جب کسی مذہب کی بنا محض نقل و سند کے سوا کچھ نہیں رہتی تو وہ مذہب کمزور اور بے اثر ہو جاتا ہے۔ روحانیات میں تقلید کو مولانا روم نے بہت لودا عمل قرار دیا ہے

ایمان اور عشق کا باہمی واسطہ۔ عشق کے اندر جو شدید تمنا ہے کیا وہ ایمان آفریں ہوتی ہے؟

زمان و مکان میں محدود حاضر کو کل حقیقت سمجھ کر اس پر فتویٰ نہ لگانا بلکہ اس کو ایک وسیع تر کل کا جزو سمجھ کر کوئی رائے قائم کرنا۔

عقل، ارادہ اور جذبات نفسِ انسانی کے تینوں عناصر ایمان میں یکجا پائے جاتے ہیں۔ ایمان کا تعلق

انسانی تجربہ ہے۔

صبر ایمان کا لازمی جزو ہے۔ تواصو بالحق و تواصو بالصبر۔

ایمان عقل کا پر پرواز ہے۔ عقل محسوسات و معقولات سے رشتہ بہ پا، پا بہ زنجیر زمین پیمائی کرتی اور دھیرے دھیرے پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہے۔

ایمان پر عمل کرنے کے لیے عقل درکار ہے لیکن عقل کی قوتیں بغیر ایمان کے نہ محرک عمل ہو سکتی ہیں اور نہ جذبہ آفریں

اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء

ایمان انبیائے عظام و اولیائے کرام میں جبلّی اور وہبی ہوتا ہے یا شدید تلاش حق اور کارزار نفس کے بعد یہ فیضان حاصل ہوتا ہے۔

تاریخ انسانی میں تمام بڑے کارنامے کسی نہ کسی قسم کے ایمان کی بدولت ظہور میں آئے ہیں۔ ایمان کی قوت ہی نے ناپید کو پیدا اور مستور کو ظہور بخشا ہے۔

ایمان زندگی کی تخلیقی قوتوں کا نام ہے۔ تخلیق بھی اسی کی بدولت ہے اور بقا کا ضامن بھی یہی ہے۔

کسی چیز پر جتنا ایمان ہوتا ہے اسی نسبت سے انسان اس کے حصول و بقا میں قوتیں صرف کرتا ہے۔ اگر کسی معاملے میں انسان کا عمل مذبذب اور بودا ہے تو یہ قطعی ثبوت اس امر کا ہے کہ اس کی تہہ میں جو ایمان ہے وہ استوار نہیں۔

انسان زندگی کا راستہ ظاہری آنکھوں سے نہیں بلکہ ایمان کی آنکھوں سے طے کرتا ہے۔ اگر ایمان غلط ہے تو انسان غلط راہوں پر گامزن ہو کر فلاح حقیقی کو کھو بیٹھے گا۔

غلط ایمان کے ساتھ صراط مستقیم پر چلنا محال ہے۔

ایمان ایک مرتبہ حاصل ہو کر خود بخود قائم رہ سکتا ہے یا جسم کی طرح اس کو بھی اپنی بقا کے لیے مسلسل غذا کی ضرورت ہے۔

عمل کا آغاز ایمان سے ہوتا ہے۔ اگر ایمان درست ہے تو عمل کے نتائج اس کو تقویت بخشتے ہیں۔ اس لیے یہ کہہ سکتے ہیں ایمان سے عمل اور عمل سے ایمان پیدا ہوتا ہے۔

مصائب حیات کے حملوں میں ایمان ڈھال کا کام دیتا ہے (حدیث)

یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کا ایمان اس کی زندگی کے تمام شعبوں میں جاری و ساری اور اس کے تمام محسوسات و تجربات پر حاوی ہو لیکن نہ اس کی کوئی منطقی توجیہہ ہو سکے اور نہ کوئی واضح بیان۔

یہ ہو سکتا ہے کہ مختلف افراد اور ملتیں اپنے ایمان کو مختلف انداز میں بیان کریں لیکن بنیادی حقیقت سب

میں مشترک ہو۔

ایمان جبر سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ایمان کے بارے میں جبر حرام ہے خواہ وہ جبر خفی ہو یا جلی۔ یہ ایمان کی خامی ہے کہ اس کے لیے جبر گوارا رکھا جائے۔

صحیح انعام کا فوری انعام یہ ہے کہ وہ انسان کو خوف و حزن سے بالاتر کر دیتا ہے۔ اسلام میں نجات کا یہی مفہوم ہے۔

ہر اس ایمان میں صداقت کا جزو موجود ہوتا ہے جس نے انسان کے لیے کسی قسم کی ظاہری یا باطنی فلاح پیدا کی ہے۔ ایمان فلاح ہی کی دعوت ہے۔

ایمان استوار ہو کر ایک جذبہ انگیز اور خلاق وجدان حیات بن جاتا ہے۔

ایمان سے زندگی میں وقار پیدا ہوتا ہے۔ اور تکریم آدم کا یقین پیدا ہو جاتا ہے۔ اور انسان محسوس کرتا ہے کہ میں مادیات و محسوسات و معقولات سے بلند تر مخلوق ہوں۔

قدر و منزلت کی مستحق خدمات

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب فضل و کمال اور ایک ایسے فلسفی تھے جن کے اعلیٰ کارناموں کی میرے دل میں بڑی وقعت ہے۔ ان کی المناک اور ناگہانی رحلت نے قوم کو ایک ایسے ممتاز فاضل کی خدمات سے محروم کر دیا ہے جس نے اسلامی فکر اور ثقافت کی اساس پر عصر حاضر کے ادب اور فلسفہ میں گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد ایک قلیل مدت میں موصوف نے ادب و ثقافت کے میدان میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ قدر و منزلت کی مستحق ہیں۔ ان کی رحلت کا احساس اور بھی زیادہ شدید ہو جاتا ہے جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ جس کام کا انہوں نے آغاز کیا تھا اس کی تکمیل کے لیے مشکل ہی سے کوئی جانشین بروئے کار آئے گا۔ میں اس غم و اندوہ میں انتہائی ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں اور خدا سے میری دعا ہے کہ وہ مرحوم کی روح پر رحمت و برکت کا مینہ برسائے۔

اختر حسین

خلیفہ عبدالحکیم مرحوم

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی وفات سے مجھے شدید صدمہ ہوا۔ میرے لیے یہ حادثہ اس لیے اور زیادہ رنج دہ تھا کہ جس دن خلیفہ صاحب کا انتقال ہوا وہ اسی روز صبح کو مجھ سے ملے تھے اور لاہور کے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کو، جس کے وہ ڈائرکٹر تھے، ترقی دینے کی تجویز پر گفتگو کی تھی۔

خلیفہ عبدالحکیم ایک مشہور و معروف ماہرِ تعلیم اور اسلام کے سچے پرستار اور اس کے مقاصد کے علمبردار تھے۔ وہ تمام عمر اپنے ملک و ملت کی ممکنہ خدمت پوری قابلیت سے انجام دیتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی روح پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

حبیب الرحمٰن

چودھری محمد ظفراللہ خاں

خلیفہ مرحوم کی تنویرِ فکر

چالیس سال سے بھی زیادہ عرصہ گزرا کہ مرحوم خلیفہ عبدالحکیم سے مجھے رسم و راہ پیدا کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ میں اس رابطے کو اپنی خوش بختی پر محمول کرتا ہوں۔ ہمارے روابط مرحوم کی المناک اور ناگہانی رحلت تک بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ برقرار رہے۔ مرحوم کے سانحۂ ارتحال سے اس مثالی شخصیت کے محضرِ حیات پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا گیا جو بلاشک و شبہ اسلام کے جدید مکتبِ فکر میں امتیازی حیثیت رکھتی تھی۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی عبقریت پہلے پہل شعر و سخن کے توسط سے برگ و بار لائی۔ رفتہ رفتہ یہی ذوق موصوف کے فلسفیانہ افکار کے اظہار کا ذریعہ بن گیا اور پھر بہت جلد مذہب اور اس کے حقائق کے فلسفیانہ اندازِ فکر کا محور بن گئے۔ تنویرِ فکر کی دولت موصوف کو اسی زاویۂ نگاہ کی بدولت نصیب ہوئی۔ خلیفہ صاحب کے فکر کی ذہنی پرواز میں تسلسل کے ساتھ اضافہ ہوتا رہا اور انہوں نے تمام ممکن الحصول وسائل سے کام لیا۔ مشرق و مغرب کے فلسفیانہ مکاتبِ فکر، نیز تصوف کے رموز و اسرار اور وحی و الہام کے وہ صاف و شفاف چشمے جن سے دین اور عقائدِ دین کو تقویت حاصل ہوتی اور روحانی غذا ملتی ہے۔ یہ ہیں وہ وسائل جن سے مرحوم کے ذہنِ رسا نے استفادہ کیا۔ جس زمانے میں وہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی علمی خدمات کی سرپرستی فرما رہے تھے انہوں نے اپنے فضل و کمال کی قوتیں اور دل و دماغ کی صلاحیتیں اس میدانِ فکر و نظر کی ان تھک خدمت پر صرف کر دی تھیں جو خصوصیت کے ساتھ ان کا اپنا میدان بن چکا تھا۔ خلیفہ صاحب کے فکر و نظر کا دائرہ محدود نہ تھا اور وہ کبھی تعصب کی دلدل میں نہیں پھنسے۔ وہ جس انداز کے افکار و خیالات کے مالک تھے ان پر جرأت و احتیاط، وسعت و ارتکاز ایسی خصوصیات کا پرتو تھا اور یہ وہ خصوصیات ہیں جنہیں بعض اوقات متبائن یا متناقض خیال کیا جاتا ہے لیکن جو حقیقت میں ایک دوسرے کی ممد و معاون ہیں۔ خلیفہ صاحب کی اکثر تحریریں اس حسین امتزاج کا کافی و وافی ثبوت بہم پہنچاتی ہیں۔

خلیفہ عبدالحکیم نے اسلامی ثقافت کے میدان میں قابلِ قدر اور اہم خدمات انجام دی ہیں اور ان کے نقوش ان کی رحلت کے بعد بھی اجاگر رہیں گے تاہم یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ جس قصرِ حکمت کی تعمیر میں تن دہی کے ساتھ مصروف تھے وہ ابھی اپنی ابتدائی منزلوں میں تھا کہ سفرِ آخرت پیش آگیا۔ مرحوم سے بڑی توقعات وابستہ تھیں اس لیے کہ قدرت

نے ان کو ایسے دماغ سے نوازا تھا جس میں ٹھہراؤ نام کو نہ تھا۔ بلکہ ایک قوت تھی جو ان کو ہمیشہ آگے قدم بڑھانے پر مجبور کرتی تھی۔ وہ بڑی سرعت سے بلندیوں پر کمند ڈال رہے تھے۔ اور اگر چند سال تک انہیں اور اپنا کام جاری رکھنے کی مہلت مل جاتی تو یہ قوی امید تھی کہ ان کی بالغ نظری کچھ اور منازل ارتقا طے کرتی اور اسلامی ثقافت کے وہ میدان بھی ان کی تحقیق کی جولانگاہ بنتے جو جدید اور عمیق اسلامی ذہن کی توجہ کے محتاج ہیں۔ ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم کی رحلت سے اسلامی ثقافت کا میدان سردست کچھ سونا سا ہو گیا ہے۔ یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی کے لیے مجھے امید ہے، اور میں دعا بھی کرتا ہوں کہ ان کے رفقائے کار اور اس میدان کے دیگر فضلا اپنی اولین فرصت میں جدوجہد کریں گے۔ جہاں سے یہ کام رُکا ہے وہیں سے اس کی ابتدا ہونی چاہیئے۔ اس صورت میں یہ فضلا ہمارے مستم بالشان دین کی خدمت میں مختلف جہتوں سے اپنی مساعی جلیلہ کا سلسلہ جاری رکھ سکتے ہیں۔

غلام دستگیر نامی

تاریخ وفات خلیفہ عبد الحکیم

از جہاں شد ناگہاں عبد الحکیم
شد بلند از رحلتش آہ و بکا!
بہر تاریخش چو نامی فکر کرد
گفت ہاتف نا شکیبا گو، برملا
رحلتِ عبد الحکیم سعد بخت
۱۹۵۹
ارتحالِ خواجۂ اہلِ وفا
۱۳۷۸

ڈاکٹر فان گرونی بام

ایک بلند پایہ مفکر

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم سے میری پہلی ملاقات شکاگو میں اس وقت ہوئی جب کہ وہ "فطرتِ اسلام" کے موضوع پر ایک عام اجتماع میں تقریر کر رہے تھے۔ اس وقت نہ صرف میں نے بلکہ اکثر سامعین نے بھی یہ محسوس کیا کہ وہ جس انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے عمداً اس مذہب کے تاریخی پس منظر سے صرفِ نظر کیا ہے۔ اپنطور پر میں نے اپنے ذہن میں یہ بات بٹھالی تھی کہ ہو نہ ہو موصوف نے محض امریکی سامعین کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے یہ روش اختیار کی ہے کہ ایک ایسے دین اور ایک ایسی تہذیب کو جس پر ایک مدت سے طبقاتی تعصبات کی گرد جمی ہوئی ہے خوشی کی بات ہے کہ اب یہ داستان قصۂ پارینہ ہو چکی ہے، شائستہ و بائستہ روپ میں پیش کریں۔ بعد میں وہ وقت بھی آیا کہ مجھے ان کی تحریروں کے مطالعہ کا اتفاق ہوا۔ اور ساتھ ہی مجھے ان سے اس ماحول میں ملاقات کا موقع ملا جس کی تخلیق ان کا نصب العین تھا اور جس کی حفظ و بقا اور ارتقا کے لیے انہوں نے اپنی پوری زندگی تج دی تھی۔ یہی موقع تھا جہاں مجھے ان کے موقف کی صحت و اہمیت کا صحیح معنی میں احساس ہوا اور اس حوصلے کا اندازہ بھی ہوا جس سے وہ اپنے نظریات کی تبلیغ میں کام لیتے تھے۔ نہ تو کسی کی مخالفانہ تحریک سے ان کے کام میں روڑا اٹکا اور نہ اس خراجِ تحسین سے ان پر اثر پڑا جو انہوں نے بعض ترقی پسند مفکرین سے وصول کیا تھا۔

وہ ایک اعلیٰ درجے کے مفکر تھے لیکن بحث و مذاکرہ میں ان کے بیان کا رنگ زیادہ کھلتا تھا۔ ان کا وسیع ذخیرۂ معلومات بحث مباحثے میں ان کا عجلت تمام بات کی تہہ تک پہنچ جانا، مشکل سے مشکل موضوع پر سادہ الفاظ میں گفتگو اور پھر اس شان سے کہ لطف ادا میں بھی فرق نہ آئے۔ یہ وہ خصوصیتیں تھیں جن کی بنا پر مجھے بارہا ان کے حضور سرِ تسلیم و تعظیم خم کرنا پڑا۔ وہ اپنے عقائد کے سلسلے میں مفاہمت کیے بغیر اپنے مخاطب کا دل موہ لیتے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کو قائل معقول کرنے کی کوشش نہیں کی لیکن اس کے باوجود کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ ان کی بات سنے اور اس پر صاد نہ کرے۔ وہ اپنے مقامِ فضل و کمال کا وقار برقرار رکھتے ہوئے نظم و نسق کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اختلافِ رائے کے باوجود وہ اپنے مخالفین سے تعلقات میں بدمزگی نہیں آنے دیتے تھے۔ میں اس راہ و رسم سے جو ان کے اور میرے درمیان تھی کافی لطف اندوز ہوتا رہا اور اب ان کی رحلت سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے۔

مجھے بھرے دل سے اس کا احساس ہے کیونکہ ان کا شمار ان چند مبلغوں میں تھا جو نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ مغربیوں پر بھی اسلام کی حقانیت کا نقش بٹھا سکتے ہیں۔ ان کی اپنے نظریات وعقائد سے وابستگی اگرچہ کچھ کم نہ تھی لیکن موصوف نے اسے ان پر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی جو ان کے ہم خیال نہ تھے۔

ڈاکٹر ہرسٹ اینڈرسن

ایک عظیم شخصیت

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم جب ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تھے تو انہوں نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ امریکی باشندوں پر یہ حقیقت واضح کی کہ دونوں اسلامی اور مغربی تہذیبوں میں محاسن بھی ہیں اور نقائص بھی۔ مناسب یہ ہوگا کہ ہم مفاہمت کی راہیں استوار کریں۔ قیامِ امن اور صلح و آشتی کی فضا پیدا کرنے کی خاطر ہمیں چاہیئے کہ ہم ایک دوسرے سے سبق لیں لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ نسلِ انسانی کے تمام افراد کی سالمیت اور مساوات کا ہمیں پورا پورا احساس ہو۔

ایک عظیم شخصیت کا یہ ایک عظیم پیغام تھا اور ہم اہلِ مغرب (میں پوری قوم کی نمائندگی کر رہا ہوں) کو کم سے کم یہ شرف تو ضرور حاصل ہے کہ ہم کو اس بیدار مغز ترجمانِ اسلام کی رفاقت و مودت کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔

ڈاکٹر جوزف شاخت

یادگار ملاقاتیں

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم سے میں صرف ایک ہی مرتبہ ملا۔ اور یہ موقع بین الاسلامی مجلس مذاکرہ کا تھا جو دسمبر ۱۹۵۹ء۔ جنوری ۱۹۶۰ء میں لاہور میں منعقد ہوئی تھی۔ کاش مجھے ان سے پھر ملنے کے مواقع ملتے۔ میرے دل میں ان کی یاد اور قدر و منزلت ہمیشہ باقی رہے گی اور میں اس یادگار استقبالیہ کو بھی فراموش نہیں کر سکتا جو انہوں نے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں ترتیب دیا تھا۔

ڈاکٹر برنارڈ لیوس

لاہور میں منعقد شدہ بین الاقوامی مجلس مذاکرہ میں شرکت کے لیے جب میں لاہور گیا تو وہاں مجھے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم سے ملنے کا موقع ملا۔ اگرچہ ہمارا ساتھ صرف چند روز رہا۔ لیکن اس مختصر عرصہ میں بھی میں ڈاکٹر حکیم کے علم و فضل سے بہت متاثر ہوا اور ان کے خلوص کا دل سے قائل ہو گیا۔

ڈاکٹر لوئی ماسی نو

خلیفہ حکیم کی صداقت شعاری

اقبال سے میرے دوستانہ مراسم کے طفیل اور اس رابطہ اتحاد کی بدولت جو ہمیں مسلم مسیحی تعاون کے سلسلے میں گارلینڈ ایوانز ہاپکنسن کی مساعی جلیلہ سے تھا، مجھے لاہور میں اسلامی مذاکرہ کے دوران ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم سے ملنے اور ملاقات کے ساتھ ہی ساتھ یہ جائزہ لینے کے مواقع حاصل ہوئے کہ موصوف نے اس بین الاقوامی نصب العین کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کیا کچھ خدمات انجام دی ہیں۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس ملاقات کے دوران اس فاضل اجل کی شخصیت نے میرے ذہن پر اچھا خاصا اثر چھوڑا ہے۔

چونکہ جدید سائنسی ترقی کا موصوف نے قریب سے جائزہ لیا تھا اس لیے وہ میرے خیال کے مطابق بعض اوقات بڑی تیزی سے قدم اٹھاتے تھے کیونکہ راسخ العقیدہ، قدامت پرست افراد کی دخل اندازی انہیں پیش قدمی سے روکتی تھی۔ لیکن موصوف کا دل انسانی ہمدردی کے جذبات سے لبریز تھا اور ہر قیمت پر وہ تحقیق حق کے درپے تھے چنانچہ اس خیال کے باوجود کہ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل میں کسی قدر عجلت پسند واقع ہوئے تھے۔ ان کی روشن خیالی اور صداقت شعاری کی قدر و منزلت کا اعتراف ناگزیر ہے۔

میں اس احساس غم و اندوہ کا دلی احترام کرتا ہوں جو ان کے اعزہ و اقربا اور احباب کو دامن گیر ہے۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکرم۔

ڈاکٹر صادق رضا زادہ شفق

ایک روشن خیال مفکرِ اسلام

مسلم مسیحی تعاون کے سلسلے میں بیروت (لبنان) میں جو کانفرنس ۱۹۵۵ء میں منعقد ہوئی تھی مجھے اس کے اجلاس میں اپنے مرحوم دوست خلیفہ عبدالحکیم سے ملاقات کا اعزاز حاصل ہوا۔ پہلی چند ملاقاتوں میں ہمارے درمیان دوستانہ روابط کی بنیاد پڑ گئی کیونکہ انہوں نے ایسا مزاج پایا تھا جو دوستی کے لیے بے حد سازگار تھا۔ ملاقات کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ موصوف وسیع المعلومات شخصیت کے حامل اور مشرقی ثقافت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ موصوف صحیح معنی میں ایک جدید الخیال مفکرِ اسلام تھے۔ میرے خیال میں ان کی اہم اور امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ وہ رواداری کا جذبہ رکھتے تھے اور دوسرے اشخاص کے خیالات کی قدر و منزلت کا احساس بھی ان کے اندر کچھ کم نہ تھا۔ جنوری ۱۹۵۸ء میں بمقام لاہور جو اسلامی مذاکرہ ہوا تھا اس میں انہوں نے اپنے رجحانات بڑی خوبصورتی سے پیش کیے تھے۔ گرما گرم بحثوں میں جو تعصب سے خالی نہ ہوتیں میں نے انہیں اعتدال پسند پایا۔ وہ ہمیشہ اپنے مسیحی احباب کو دینی مسائل پر اظہارِ خیال کا بڑی فراخ حوصلگی سے موقع دیتے تھے۔ چونکہ موصوف نے آفاقی ذہن پایا تھا اس لیے انہوں نے قرآن حکیم کی تعلیمات میں بھی آفاقی رجحانات کی سراغ رسانی کی تھی۔ موصوف کی تصنیف اسلامک آئیڈیالوجی میں یہ حقیقت واشگاف نظر آتی ہے۔ یقیناً وہ ایک منور الفکر عبقری اور ایک ایسے حقیقت پسند مفکر تھے جو حقیقتِ کبریٰ پر پُرخلوص ایمان رکھتے تھے۔ ان کی دلی اور مخلصانہ کوشش یہ تھی کہ اربابِ عقل و دانش اس صراطِ مستقیم پر گامزن ہوں جس کی نشاندہی مذہب نے کی ہے۔ وہ ایسے مذہب کے قائل نہ تھے جس کا دائرہ تعصبات و توہمات نے تنگ کر دیا ہے۔ موصوف نے یہ حقیقت واضح کرنے کی سعی بلیغ کی کہ اسلام وہ دین ہے جس نے عالمگیر صداقت کا درس دیا ہے اور اس کا مقصدِ وحید یہ ہے کہ نسلی لسانی تعصب، جہالت، افتراق اور عقل دشمن خیالات سے دامن کش ہو۔ موصوف نے اپنی تصنیفات میں اپنے عقیدہ کی شرح و بسط کے ساتھ وضاحت کی ہے۔ ان بین الاقوامی اجتماعات میں جہاں مجھے بھی رفاقت کی سعادت نصیب ہوئی ہے میں نے کھلی آنکھوں دیکھا کہ وہ اپنے نصب العین پر بڑی مضبوطی کے ساتھ کاربند رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ تعاون کے حقیقی جذبہ کے ساتھ صداقت کی دیانتداری سے جستجو کی جائے۔ آخر میں میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ موصوف کے اندر ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور ان کے احباب و رفقا ان کی بذلہ سنجی اور خوش طبعی سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ ہر شخص کے دل میں گھر کر لیتے تھے۔

ڈاکٹر ایرک بتھ من

پاکستان کا ایک ممتاز فاضل

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم سے میری پہلی ملاقات بحمدون (لبنان) کی پہلی مسلم مسیحی کانفرنس کے موقع پر ہوئی۔ ہمارے درمیان بہت جلد قریبی روابط پیدا ہو گئے غالباً اس لیے کہ اکثر بنیادی مسائل پر ہمارے نظریات ملتے جلتے تھے۔ بعد میں دوسری ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اس امر کی اور بھی زیادہ تائید و توثیق ہو گئی۔ مشرقی و مغربی افکار پر ایک وسیع نظر کی بدولت ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم پر انسانی فطرت کی کمزوریوں اور حماقتوں کی حقیقت اتنی واضح ہو چکی تھی کہ جب ان کے رفقائے کار بڑھی چڑھی اور کھینچ تان کی باتیں کرتے تھے تو وہ ہلکے سے تبسم کے ساتھ ان سے صرف نظر کر لیتے تھے اور ان کی طبیعت میں کسی قسم کا میل نہیں آنے پاتا تھا۔ آپ کے مذہبی تصورات پر تعصب کا لیبل نام کو بھی نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ جو حقائق و جذبات کے مابین بمشکل خط فیصل کھینچ سکتے تھے ان کی قوت ضبط و تحمل سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

مسلم مسیحی تعاون کمیٹی کے سلسلے میں جب موصوف نے ریاستہائے متحدہ امریکہ کا دورہ کیا تو انہوں نے اسلام کی تعلیمات ایسے باوقار اور انسانیت پرور انداز میں پیش کیں کہ ان کے سامعین نے اچھا خاصا اثر قبول کیا۔ ان میں سے اکثر نے عمر بھر کسی مسلمان کو دیکھا یا سنا نہیں تھا۔

بلاشک و شبہ موصوف پاکستان کے ایک ممتاز فاضل تھے۔ قدرت نے ان کی شخصیت میں کچھ ایسے جوہر بھر دیئے تھے کہ وہ مذہبی تعلیمات کو ایسے خوش آیند اسلوب میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے کہ دور حاضر کے جدت پسند ذہن بھی ان سے مطمئن ہو جاتے تھے۔

جب میں نے حال ہی میں یہ سنا کہ ڈاکٹر خلیفہ نے سفر آخرت اختیار کیا ہے تو غم و اندوہ سے میری طبیعت نڈھال ہو گئی۔ میں اس عظیم نقصان میں جو ان کی رحلت سے آپ کو اور آپ کے ملک کو پہنچا ہے آپ کے ساتھ برابر کا شریک ہوں۔ مجھے ذاتی طور پر بھی اس نقصان کا احساس ہے اور وہ اس لیے کہ میں اسلامی فکر سے آشنا ہونے کی خاطر اس فاضل جلیل سے مزید راہ و رسم پیدا کرنے کی فکر میں تھا۔ اگر وہ زندہ رہتے تو پاکستان یا ریاستہائے متحدہ امریکہ میں پھر ملاقات کی صورت پیدا ہوتی۔

الشیخ علی کاشف الغطاء

ایک باکمال شخصیت

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے ممالک اپنے مادی وجود، اپنی صنعتی و صناعتی عظمت اور اپنے طبیعی حسن و جمال پر ہی فخر نہیں کرتے بلکہ ان کے علاوہ بھی اگر وہ نازاں ہیں تو اپنی اس دولت پر جسے رفعت فکر، عظمت ادب اور کمال علم و فن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ علم و فضل کا وہ چشمہ جس سے دنیا میں یمن و سعادت کے سوتے پھوٹ نکلتے ہیں اور گلستان ادب کا وہ پھول جو تعمیر و ترقی کی ہوا کے جھونکوں سے کھلتا اور جس کی مہک مہک سے انسانی معاشرہ کی روح امتزاز کرتی ہے، گھنے باغوں، زمین پر نور پھڑکتے ہوئے سبزہ زاروں، دبے ہوئے خزانوں اور بیش قیمت وسائل حیات سے بھرپور زمین کے خطوں سے کہیں بہتر ہیں ــــ وہ ممالک قابل قدر ہیں جو ایسے ممتاز افراد پر ناز کرتے ہیں جن کے بل بوتے پر انہیں عروج و کمال کی سعادتیں نصیب ہوتی ہیں نہ صرف یہ بلکہ صفحۂ تاریخ پر ان کے خلود و دوام کی مہر ثبت ہو جاتی ہے۔ اتنی بے پناہ دولت و ثروت ان ممالک کے حصے میں آتی ہے جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ قدرت انہیں سلطنت کا تخت اور ہمیشگی کا تمغہ عطا کرتی ہے۔ جن ممالک میں چیدہ و برگزیدہ ہستیاں رونق افروز ہوتی ہیں، تعمیر و ترقی کی راہیں ان کے لیے کھل جاتی ہیں۔

اس نوع کی ایک اعلیٰ مثال خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی شخصیت ہے جس کے وجود سے حیات اور توانائی کے شعلے بھڑکتے تھے۔ اسے ادب و کمال کے ایک مثالی پیکر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ شخصیت ایک ایسا روشن صفحہ تھی جس کی حکمت کے نور سے زندگی کی راہیں چمک اٹھتی تھیں۔ اس نے کردار، گفتار اور قلم کی طاقت سے جہالت کا سختی سے مقابلہ کیا اور باطل کو اپنے دبدبہ و جلالی سے اس نے مرعوب کر دیا تھا۔ قدرت نے مجھے اور مرحوم کو اس دینی جہاد میں یک جا کر دیا تھا جو مؤتمر اسلامی و مسیحی میں پیش آیا تھا۔ یہ ایک عظیم ترین دینی مؤتمر تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار مرحوم سے ملاقات کی۔ میں نے مرحوم کو مکارم و فضائل کا مجموعہ اور اعلیٰ ترین عادات و اطوار کی ایک دنیا پایا۔ موصوف کی شخصیت گویا تنویر علم اور کمال منطق یا بالفاظ دیگر علم و منطق کا ایک حسین امتزاج تھی۔ میں نے موصوف کی تالیفات و تصنیفات میں عمق فکر، کمال علم اور بلاغت تحریر کی نمایاں خصوصیات دیکھی ہیں۔ مرحوم کی بقا کے لیے آثار علم اور صالح اعمال کا ترکہ کافی ہے۔ اگر آج ہم مرحوم کی رحلت پر اظہار تاسف کرتے ہیں تو صرف

اس سبب ہے کہ آپ ایک فقید المثال فلسفی اور ایک عدیم النظیر حکیم تھے۔ مرحوم کی جدائی کا قلق شدید ہے اور دل و دماغ اس سے بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے کارکنانِ قضا و قدر جسے چاہتے ہیں منتخب کر لیتے ہیں اور انہیں اس بات کی مطلق پروا نہیں ہوتی کہ اس انتخاب سے ابنائے آدم کتنے عظیم نقصان سے دوچار ہوں گے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی

گُل افشانیٔ گفتار

خلیفہ صاحب مغفور سے صرف ایک بار علی گڑھ میں ایک دوست کے گھر پر شب میں تھوڑی دیر کے لیے ملاقات ہوئی تھی جس کو تقریباً ۲۰۔۲۲ سال ہوئے۔ مرحوم اپنے اشعار سے حاضرین کو مسرور و مسحور کر رہے تھے۔ اشعار ہی سے نہیں گل افشانیٔ گفتار" اور اپنے حسنِ خداداد سے بھی! جتنے لوگوں سے اب تک ملاقات ہوئی سب سے یہی سنا کہ علمی تبحر کے علاوہ طباعی، خلوص و خوش مزاجی میں بھی مرحوم کو قدرت کی طرف سے بہرۂ وافر ملا تھا۔ ثقافت میں مرحوم کے مضامین دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا کہ کتنے مشکل اور نازک علمی و دینی مسائل کو کس خوبی سے واضح کر دیتے تھے۔ جیسے ان کو زیرِ بحث مسئلہ ہی پر عبور نہ ہو بلکہ پڑھنے والوں کے مختلف ذہنی مدارج کا بھی ادراک ہو۔ پاکستان سے تین آدمیوں کا یکے بعد دیگرے جلد جلد اٹھ جانا بڑا دردناک سانحہ ہے یعنی خلیفہ صاحب، پطرس اور سالک کا۔ جن کا بدل اس وقت دور دور نظر نہیں آتا۔ ان عاشقانِ پاک طینت پر خدا کی رحمت ہو۔

ڈاکٹر عزیز ایس۔ عطیہ

ڈاکٹر خلیفہ کے حکیمانہ تصورات

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم سے اگرچہ مجھے دیرینہ نیاز حاصل نہیں رہا اور اس اعتبار سے مجھے اس کے قدردانوں کی صفِ اوّل میں جگہ نہیں مل سکتی، تاہم مجھے اس چیز کا اعتراف ہے کہ ڈاکٹر حکیم کے ان تھک جذبۂ خیراندیشی اور روحِ اسلام سے متعلق ان کی فراخدلانہ اور انسانیت نوازانہ تصریحات کے مثالی انداز نے نہ صرف میری معلومات میں قیمتی اضافہ کیا ہے بلکہ میرے اکثر اربابِ وطن کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ۱۹۵۴ء میں بمقام بحمدون (لبنان) پہلی مسلم مسیحی کانوکیشن کے دوران ڈاکٹر حکیم سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کانوکیشن میں موصوف نے اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا تھا کہ نئی پود میں روحانی قدریں اجاگر ہونی چاہئیں۔ ان کی شخصیت اور ان کی تقریر کا انداز یہ کہے دے رہا تھا کہ ان میں ایک معلّم کی اعلےٰ صفات قدرت نے ودیعت کی ہیں اور مزید برآں دینی اقدار کی قدر و منزلت کا شدید احساس بھی ان پر غلبہ پائے ہوئے ہے۔

میں موصوف کی تقریر سے بہت زیادہ متاثر ہوا تھا اور اس تاثر کا سبب یہ تھا کہ مجھے پہلی بار یہ علم ہوا کہ اسلام اور مسیحیت کے اصولوں میں کتنی ہم آہنگی ہے۔ میرے لیے انکشاف حیرت و استعجاب کا موجب تھا کہ وہ ان امتیازات و اختلافات کی سطح سے کتنے بلند ہیں جنھوں نے انسانی معاشرہ کا شیرازہ منتشر کر دیا ہے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اتنے اعلیٰ تصورات کے حامل ہیں کہ ان کی نظر عصرِ حاضر کے دھندلکوں کا دامن چاک کرتی ہوئی روشن مستقبل کے دریچوں پر دستک دے رہی ہے۔ موصوف نے فرمایا کہ قدرت کا ہم سے یہ مطالبہ ہے کہ ہم دنیا کو اپنی کوششوں سے بہشت منظر بنانے میں اس کے ساتھ تعاون کریں۔ بعد میں ہماری ملاقاتیں امریکہ اور دنیا کے مختلف حصوں میں ہوئیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ ان عوائق و موانع کے باوجود جو پست سطح کے اشخاص کی رفتارِ ترقی روک دیتے ہیں قدرت کے ساتھ رضاکارانہ تعاون میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم سے چند سال قبل پرنسٹن یونیورسٹی میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ یہاں میں ان ایام میں جب کہ موصوف ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے عظیم ثقافتی مراکز کے دورہ پر تھے علومِ مشرقیہ کے شعبہ میں معلّمانہ

فرائض سر انجام دے رہا تھا۔ اس شعبہ کے چیئر مین کو اور مجھے ان کے ساتھ شرکت طعام کا اتفاق ہوا اور اس کے بعد فیکلٹی لونج کے پُرسکون گوشے میں قہوہ پینے کے لیے رخصت ہوئے جہاں ہم نے کچھ دیر علمی بحث و نظر میں حصہ لیا۔ موصوف کی اثر آفریں شخصیت نے ہم سے خراج تحسین وصول کیا۔ ان کے تبحر علمی اور عمیق فلسفیانہ انداز فکر کو مشرقی وضع کے حکمائے دانش پژوہی نے چار چاند لگا دیئے تھے۔ اس وقت سے ان کی یاد کے نہ مٹنے والے نقوش میرے لوح دماغ پر مرتسم رہے ہیں۔ میں موصوف سے اپنے روابط کی تجدید چاہتا تھا کہ بصد حسرت و غم مجھے یہ اطلاع ملی کہ موصوف راہگرائے عالم بقا ہو گئے ہیں۔ ان کے ملک، مشرقی ثقافت اور تمام عالم میں پھیلے ہوئے ان کے احباب کے لیے یہ نقصان کتنا عظیم نقصان ہے۔

پروفیسر ایم ایم شریف

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم

خلیفہ عبدالحکیم مرحوم سے میری ملاقات ایک نہایت عجیب واقعہ سے شروع ہوتی ہے۔ میں اپنے دیہاتی اسکول سے آٹھویں جماعت پاس کرکے اسلامیہ ہائی اسکول، شیرانوالہ گیٹ کی جونیر کلاس میں صرف انگریزی پڑھنے کے لیے داخل ہوا۔ خلیفہ حکیم اس وقت اسلامیہ اسکول کی ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ میری ان سے مطلقاً واقفیت نہ تھی۔ اسلامیہ ہائی اسکول میں جمعہ کے روز پڑھائی شروع ہونے سے پہلے اسکول کے مولوی صاحب وعظ کہا کرتے تھے اور اسے سننے کے لیے اسکول کی تمام جماعتیں صحن میں جمع ہوتی تھیں۔ ایک روز اسی وعظ کے دوران میں ایک طالب علم نے جو میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا پیچھے کی طرف مڑکے دیکھا اور غصے کے عالم میں میری طرف دیکھ کر مجھے گالی دی۔ میں ایک دیہاتی لڑکا تھا اور مجھے گالیاں نہ آتی تھیں۔ میں نے گالی کے جواب میں انہیں ایک گھونسہ رسید کیا۔ میرے خیال میں اس گالی کی وجہ یہ تھی کہ کہیں بے خبری میں میری کتابیں انہیں چھو گئی تھیں۔ اور قصہ آگے نہ بڑھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس لڑکے کا نام عبدالحکیم ہے۔ اس کے بعد اکثر نماز یا کھیل کے اوقات میں ہماری مٹھ بھیڑ ہوتی تھی اور گو ہم دونوں کے اسکول کے دوست مشترک تھے ہماری بات چیت نہ ہوتی تھی۔ اسی طرح ایک سال گذر گیا۔ بعد میں نامعلوم کس طرح ہم دونوں ایک دوسرے سے بولنے لگے۔

سینیئر کلاس پاس کرکے میں ماڈل اسکول میں چلا گیا۔ میں نے اس اسکول سے اور عبدالحکیم نے شیرانوالہ اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وہ فورمن کرسچین کالج میں چلے گئے اور میں دو چار ماہ گورنمنٹ کالج میں رہنے کے بعد ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخل ہو گیا۔ خلیفہ حکیم نے عزیز و اقربا کے کہنے سننے پر سائنس کا کورس لیا اور یہی بات میں نے کی۔ مگر میں نے دو تین ہی ماہ میں یہ کورس چھوڑ دیا، مگر خلیفہ کا یہی کورس جاری رہا۔ انہیں سائنس کی طرف کوئی رغبت نہ تھی، چنانچہ ان کا یہ سال ضائع ہوا اور اس طرح میں ان سے ایک سال آگے ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے بھی علی گڑھ پہنچ کر فرسٹ ایر میں داخلہ لے لیا۔ جب تو ہم دو بچھڑے ہوئے دوستوں کی طرح ملے اور اکثر ملتے رہے۔ ایف اے پاس کرنے کے بعد میں تو وہیں رہا مگر خلیفہ سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں چلے گئے۔ ہم دونوں نے بی اے میں فلسفہ بطور اختیاری مضمون لیا۔

خلیفہ مرحوم پروفیسر سین کے بہت چہیتے شاگرد تھے۔ مجھ پر بھی میرے پروفیسر اختر یونی نظرعنایت رکھتے تھے۔ میں نے بی اے الٰہ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۱۳ء میں پاس کیا اور ایم اے میں داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ اس وقت پنجاب میں فلسفہ میں ایم اے کی تعلیم صرف سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں ہوتی تھی۔ میں نے الہ آباد کے مقابلے میں سینٹ اسٹیفن کالج میں داخلہ کو ترجیح دی اور پنجاب یونیورسٹی سے اجازت لے لی کہ میں ایم اے کا امتحان ایک سال میں دے لوں اس لیے میرا داخلہ ایم اے کی دوسری کلاس میں ہوا۔ خلیفہ نے وہیں بی اے پاس کر کے ایم اے کے فرسٹ ایر میں داخلہ لیا۔ میں چند ایک ماہ سینٹ اسٹیفن کالج میں رہنے کے بعد کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے انگلستان چلا گیا اور خلیفہ وہیں رہے میرا کیمبرج کا کورس دو سال کا تھا۔ جب ۱۹۱۷ء میں میں وہاں سے فارغ ہو کر آیا تو خلیفہ بھی ایم اے کا امتحان درجہ اول میں پہلے نمبر پر پاس کر چکے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں میں علی گڑھ یونیورسٹی میں بحیثیت سینیئر پروفیسر ملازم ہو گیا اور خلیفہ مرحوم عثمانیہ یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔

دو تین سال کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے سکالرشپ لیکر جرمنی چلے گئے اور وہاں تین سال کے بعد پی ایچ ڈی لے کر غالباً ہم ۱۹۲۴ء میں واپس آئے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر ہو گئے۔ اس کے بعد ہم دونوں کی زندگی متوازی چلتی رہی۔ جب بھی وہ علی گڑھ آتے، مجھ سے ملے بغیر واپس نہ جاتے۔ میں بھی جب کبھی حیدر آباد جاتا ان سے اور ان کے بیوی بچوں سے ضرور ملتا۔ چونکہ عثمانیہ یونیورسٹی میں تعلیم بذریعہ اردو ہوتی تھی اس لیے خلیفہ مرحوم کو لیکچر اردو میں دینے پڑتے تھے۔ اسی سلسلہ میں یونیورسٹی میں ان سے بہت سی کتابیں اردو میں ترجمہ بھی کروائی گئیں۔

خلیفہ حکیم کو طالب علمی کے زمانے ہی سے ادب میں کافی شغف تھا۔ وہ اردو اور انگریزی دونوں نہایت روانی سے لکھتے تھے اور دونوں زبانوں میں ان کی تحریر نہایت شگفتہ ہوتی تھی۔ خلیفہ، اقبال کے انداز میں شعر بھی کہتے تھے اور نہایت عمدہ شعر کہتے تھے۔ ایک نظم ان کی امیر خسرو کے رنگ میں چرخے پر بھی تھی۔ وہ ایسی مقبول ہوئی کہ ان کے احباب اکثر ان سے اس کے سنانے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ دوستوں کی صحبت میں ان کی گفت گو اکثر نہایت دلچسپ ہوتی تھی۔ ان کی طبیعت نہایت باغ و بہار تھی اور جو شخص ان سے ایک دفعہ مل لیتا وہ ان کی لچھے دار مگر فلسفیانہ گفت گو کو کبھی نہ بھولتا۔

یوں تو ہم میں سے ہر شخص کشمیر کو جنت نظیر سمجھ کر وہاں جانے کو ایک نعمت سمجھتا تھا لیکن خلیفہ حکیم مرحوم کو کشمیری ہونے اور پھر اس پہ شاعر ہونے کی وجہ سے کشمیر سے خاص محبت تھی۔ چنانچہ دو ایک سال کے لیے وہ حیدر آباد کی نوکری چھوڑ کر کشمیر میں ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ وہاں انہوں نے ڈل لیک کے کنارے ایک خوبصورت مکان بھی اس خیال سے بنوایا کہ ملازمت کے اختتام پر وہ وہیں رہائش اختیار کریں گے، لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا۔

جب سر محمد اقبال شروع شروع میں پالیٹکس میں آئے تو اس زمانے میں خلیفہ بھی حیدر آباد سے چھٹی لے کر کچھ عرصہ کے لیے اس خیال سے لاہور چلے آئے کہ پالیٹکس میں حصہ لیں لیکن چند ماہ کے بعد انہیں معلوم ہوگیا کہ پنجاب کی پالیٹکس بہت گنجلک تھی۔ چنانچہ اقبال کے ان دوستوں نے جو انہیں پالیٹکس میں گھسیٹ لائے تھے عین وقت پر انہیں دھوکہ دیا اور تمام وزارتیں خود سنبھال بیٹھے۔ چنانچہ خلیفہ حیدر آباد واپس چلے گئے اور ڈین آف ریسرچ مقرر ہوئے۔ مجھے بھی علی گڑھ یونیورسٹی میں پرو وائس چانسلر ہونے کے مواقع ملتے رہے۔

ملک کی تقسیم کے بعد ہم دونوں پاکستان چلے آئے۔ خلیفہ مرحوم نے مسٹر غلام محمد کی مدد سے جو اس وقت پاکستان کے وزیر خزانہ تھے ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی بنا ڈالی اور اس کے مینجنگ اور اکیڈیمک ڈائرکٹر بنے۔

میں ایک سال تک پنجاب یونیورسٹی کمیشن کے سکرٹری کی حیثیت سے کام کر کے اسلامیہ کالج لاہور کا پرنسپل ہوگیا اس عرصہ میں میں نے گورنمنٹ کی مدد سے "پاکستان فلاسفیکل کانگریس" کی بنا ڈالی۔ کانگریس کے پہلے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لیے میں نے خلیفہ حکیم کا نام تجویز کیا اور انہوں نے ایک نہایت اعلیٰ خطبۂ صدارت پڑھا۔ اس کے ایک سال بعد کانگرس کے کارکنوں نے یہی عزت مجھے بخشی۔

ہندوستان کی فلاسفیکل کانگریس کے ہم دونوں ممبر تھے اور خلیفہ اس کانگریس کے مابعد الطبیعات کے سیکشن اور سائیکالوجی کے سیکشن کے صدر بنے۔ میں بھی مابعد الطبیعات کا صدر بننے کے بعد ۱۹۴۵ء میں ساری انڈین فلاسفیکل کانگریس کا صدر چنا گیا۔

ملک کے باہر بھی لوگ ہم دونوں کو جانتے تھے۔ چنانچہ ہم دونوں کو اکثر دعوتیں اکٹھی ملا کرتی تھیں۔ ہم دونوں اکٹھے سیلون گئے۔ راستے میں میں بیمار ہوگیا اور خلیفہ مرحوم نے میری تیمارداری کی۔ اس کے بعد ہم دونوں اکٹھے آسٹریلیا گئے۔

خلیفہ مرحوم نے اپنے آپ کو ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ اپنے ادارہ کے لیے روپیہ حاصل کرنے کے لیے سیکرٹری فنانس کو ملنے گئے تھے اور وہیں ان کے دفتر میں خلیفہ کے دل نے جواب دیا اور وہ ہم سب کو داغ مفارقت دے گئے۔ خدا انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین! اب دوستوں نے ان کا شروع کیا ہوا کام مجھے سونپا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ مجھے اسے جاری رکھنے کی توفیق دے۔

پروفیسر قاضی محمد اسلم

خلیفہ صاحب کی ممتاز شخصیت

خلیفہ عبدالحکیم میرے ذہن کے افق پر پہلے پہل اس وقت ابھرے جب وہ لاہور کے ایف سی کالج میں تعلیم پاتے تھے۔ میں اس وقت امرتسر میں اسکول کے درجے طے کر رہا تھا۔ اور خلیفہ صاحب کا ذکر اپنے بھائیوں اور عزیزوں سے سنتا جو لاہور کے کالجوں میں پڑھتے تھے۔ ایک قابل نوجوان جس کی ملاقات بڑے بڑے آدمیوں سے ہے۔ جو خود اعتمادی ہیں، گفتگو میں، تحریر میں، تقریر میں اپنے ہم عمروں میں یکتا ہے۔ اور پبلک جلسوں میں کھڑے ہو کر برملا اظہار خیال سے نہیں چوکتا۔ لیکن سائنس کے مضامین سے اسے کچھ کد ہے۔ شاید بزرگوں کے کہنے سننے پر سائنس کے مضامین لے رکھے ہیں۔ لیکن دل کا ذوق کچھ اور قسم کا ہے۔ اس کے بعد یہ بھی کان میں پڑتا رہا کہ وہ یکتا نوجوان سائنس چھوڑ کر آرٹس کے مضامین لے کر علیگڑھ سے ایف اے، بی اے اور انجام کار مشہور سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی سے فلسفہ کا ایم اے بڑے امتیاز سے پاس کر چکا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں علیگڑھ کالج میں پڑھتا تھا۔ ایک روز ہماری سائنس ایسوسی ایشن کا خاص اجلاس تھا۔ سائنس کے استاد تقریباً سب کے سب اس میں شریک تھے۔ ڈاکٹر ولی محمد۔ فیروزالدین مراد۔ مسٹر ایچ کرال وغیرہم۔ فیروزالدین مراد نے ایک بلیغ خطبہ پڑھا۔ اور ایک جگہ رُک کر ایک نوجوان کی طرف اشارہ کر کے اس کی تعریف کرنی شروع کی کہ ہماری قوم میں قابلیت کی کمی نہیں۔ اس پر ایک نہایت خوش لباس، خوش شکل گورا چٹا نوجوان اپنی کرسی میں اپنے آپ کو ذرا درست کرنے لگا۔ منہ پر حجاب کے آثار تھے۔ گویا تعریف سے پانی پانی ہوا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا یہی خلیفہ عبدالحکیم ہیں جن کا ذکر کئی سال پہلے سے سُن رہے تھے۔ بعد میں ان کو یونیورسٹی یونین میں تقریریں کرتے سنا۔ اور مقابلے میں غصہ اور جوش دکھاتے دیکھا۔ واقعی شخصیت اور اچھی زبردست شخصیت۔ قدرت نے لیاقت اور ظاہری جاذبیت بھی دے رکھی تھی، اور کردار کی طاقت اور تیزی بھی۔ وہ میرے بزرگ دوست اور کالج کے زمانے کے ساتھی ڈاکٹر عطاءاللہ بٹ کے رشتہ میں بھائی تھے۔ لیکن ان کو قریب سے دیکھنے کا ابھی موقع نہ ملا تھا۔ میں نے علیگڑھ میں تعلیم کے بعد لاہور گورنمنٹ کالج سے ایم اے کیا اور پھر علیگڑھ یونیورسٹی کے اسٹاف میں ایک سال رہ کر پنجاب گورنمنٹ کی سروس میں آ گیا۔ اور انجام کار گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور نفسیات کے شعبہ میں پڑھانے لگا۔ اور اس عرصہ میں کیمبرج یونیورسٹی

میں بھی دو سال رہ کر تعلیم حاصل کی۔ خلیفہ عبدالحکیم بھی اپنے طبعی مذاق یعنی فلسفہ کی تعلیم جرمنی میں مکمل کر کے عثمانیہ یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر بن چکے تھے۔ لاہور اکثر آتا جاتا رہتا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ فلسفہ کے صدر پروفیسر جی۔ سی چیٹرجی تھے جو ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۹ء تک اس عہدے پر سرفراز رہے اور گویا شمالی ہند میں فلسفہ و نفسیات کے بے شمار ہندو سکھ مسلمان شاگردوں کے استاد اور علمی ذوق، شوق مطالعہ اور سوچ بچار میں ان کے لیے نمونہ تھے۔ چیٹرجی غیر معمولی قابلیت کے اسکالر اور بڑی کشش رکھنے والے استاد تھے۔ ان کے لیکچر میں ایک سحر کا سا اثر ہوتا اور پڑھائی کا یہ گھنٹہ ایک سکوت اور کامل استغراق کا گھنٹہ ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں معلوم ہوا کہ چیٹرجی سینٹ اسٹیفنز کے اس زمانے کے ایم اے ہیں جس زمانے کے اور بھی کئی ایم اے ہیں۔ جن میں سے سب نے اپنے اپنے حلقہ میں اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق نام پیدا کیا ہے۔

پروفیسر ایم ایم شریف جو برسوں علیگڑھ کے شعبۂ فلسفہ کے صدر رہے اور پاکستان بننے کے بعد اسلامیہ کالج کے پرنسپل اور اس وقت انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر کے ڈائرکٹر (گویا اس زمرہ میں خلیفہ عبدالحکیم کے جانشین) اور پاکستان فلاسفیکل کانگریس کے بانی اور مستقل صدر اور پاکستان کے متعدد علمی اور تعلیمی کاموں اور منصوبوں کے سربراہ۔ وہ بھی اسی زمانے کے سینٹ سٹیفنز دہلی کے ایم اے ہیں۔ میرے دوست اور استاد اور گورنمنٹ کالج لاہور میں برسوں کے ساتھی ملک احمد حسین حال پرنسپل اسلامیہ کالج گوجرانوالہ بھی اسی زمانے کے ہیں۔ اسلامیہ کالج پشاور کے پروفیسر عبدالرحیم نیازی بھی جن کے بے شمار شاگرد ان سے والہانہ تعلق رکھتے ہیں اسی زمانے کے ہیں۔ کچھ اور بھی مثلاً پروفیسر برکت اللہ جو کچھ زمانہ تعلیم تدریس میں رہ کر بعد میں پادری بن گئے۔ پروفیسر اسرائیل لطیف بھی جو بڑے زمانے تک ایف سی کالج لاہور کے شعبہ فلسفہ و نفسیات کے کرتا دھرتا رہے اور نفسیاتی معالج کے طور پر کام کرتے ہیں اسی زمانے کے ہیں۔ یہ سب اور ان کے آگے پیچھے کئی اور فلسفہ کی تعلیم پانے والے شمالی ہند کے ایک مشہور اور یاد رہنے والے استاد مسٹر این کے سین کے شاگرد اور ان کی علمی عظمت مشفقانہ کردار کا گویا ثبوت ہیں۔ اس تعلق کی وجہ سے خلیفہ عبدالحکیم بھی جب لاہور آتے تو چیٹرجی سے ملتے اور ہمیں بھی خلیفہ صاحب کی گفتار اور ان کے لطائف اور نوک جھونک سننے کا قریب سے موقع ملتا۔ ایک تقریب اس وقت کی پنجاب لٹریری لیگ کے ماتحت تھی (اس لیگ کے ذکر پر اس کے ان تھک سیکرٹری مسٹر رپوراج چوہدری کو داد دینی پڑتی ہے کہ اس شخص نے برسوں ایک معیار اور ایک رفتار پر اس نہایت ہی دلچسپ اور مفید ادارے کو چلایا۔ اس میں بڑے بڑے ہندو سکھ مسلمان اہل علم، ہر فن اور ہر میدان کے دعویٰ شامل ہوتے اور اپنے اپنے افکار اور اظہار خیال سے دوسروں کو مستفید کرتے) اس تقریب میں خلیفہ عبدالحکیم اپنی فلسفیانہ پوزیشن کو پیش کر رہے تھے۔ غالباً دو تین لیکچروں کا

سلسلہ تھا عنوان "خدا اور انسان" یا اس سے ملتا جلتا تھا۔ یعنی خالق مخلوق میں جو صفاتی مشابہت اور صفاتی امتیاز پایا جاتا ہے اس کے پردے میں ایک مستقل فلسفہ حاضرین کے لیے پیش کیا جا رہا تھا، ہمارے لیے یعنی لاہور کے نسبتاً کم عمر استادوں کے لیے) یہ تقریب خاص دلچسپی کا باعث تھی۔ ہم سب پر چیٹرجی کے علم، فصاحت و بلاغت، انگریزی زبان پر قدرت اور تخیل اور فکر کی چمک دمک کا اثر تھا۔ چیٹرجی آزاد خیال سہی لیکن ہندو نام کے عیسائی تھے۔ ان کی لیاقت کے اعتراف کے ساتھ ہمیں کچھ رشک اور مقابلے کا احساس بھی ہوتا تھا۔ کیا کوئی مسلمان استاد فلسفہ بھی ان کی فکر کا ہے؟ خلیفہ عبدالحکیم کو دیکھ کر اور ان کی تقریر سُن کر ہم کو یہ محسوس ہوا کہ کیوں نہیں۔ ہے اور واقعی ہے۔ بلکہ خود اعتمادی اور مذاکرے میں ڈٹ کر لڑنے والا اور نہ ہارنے والا ہے۔ جو لاہور میں پیدا ہوا اور لاہور ہی سے ابھر کر دکن کی ایک مشہور یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کا صدر ہے۔ چیٹرجی کیمبرج کے ایک استاد پروفیسر مور سے پڑھ کر اس جدید (اس وقت کے جدید) فلسفہ کے شارح بنے تھے جو اپنا سارا رنگ ڈھنگ طبیعی سائنس سے لیتا ہے۔ گویا سائنس جب بالکل نظری اور نظریاتی ہو جاتی ہے اور اپنے تمام مشاہدات اور مفروضات کو ایک جامع اور مانع بیان میں اتار کر پیش کرنے لگتی ہے چیٹرجی اس قسم کی سائنس کے ملتے جلتے فلسفہ کے داعی تھے۔ ان کو انگریزی زبان پر خاص قدرت حاصل تھی۔ تھوڑا پڑھاتے تھے لیکن خوب اچھی طرح سے۔ نچوڑ ان کی شرح و بسط کا دہریت ہی ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ کئی موقعوں پر جب مذہب کے متعلق بحث چھڑ گئی تو وہ مذہب کے خلاف تھے اور باقی سب لوگ ان کے خلاف تھے۔ بعد میں مجھے محسوس ہونے لگا کہ وہ کوئی غالی دہریے نہ تھے بلکہ شاید دہریہ تھے ہی نہیں۔ صرف ماحول کا مقابلہ کرتے کرتے وہ دہریت کا دم بھرنے لگتے تھے۔ واللہ اعلم۔

بہر حال پنجاب لٹریری لیگ کے ان دو تین اجلاسوں میں خوب گہما گہمی رہی۔ خلیفہ عبدالحکیم مقرر اور چیٹرجی صدر۔ ہر تقریر کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ اور وہ بھی زیادہ تر مقرر اور صدر کے درمیان۔ خوب مزہ آتا تھا۔ دونوں کا نقطۂ نظر کافی مختلف، جذباتی میلان بھی مختلف، کلچرل پس منظر بھی مختلف، انگریزی بولنے کا طرز بھی مختلف۔ چیٹرجی نہایت لطیف انگریزی لہجے اور انگریزی اسٹائل کی انگریزی بولتے اور خلیفہ عبدالحکیم پنجابی طرز اور پنجابی سٹائل کی انگریزی بولتے لیکن نہایت ٹھوس اور نہایت صحیح۔ دونوں ایک دوسرے کی ٹکر کے تھے لیکن ایک فرق نمایاں تھا چیٹرجی باوجود ہر کمال کے بحث میں دب جاتے لیکن خلیفہ عبدالحکیم دبنے کا نام نہ لیتے۔ خلیفہ عبدالحکیم کا علمی مذاکروں اور علمی مجالس میں ہمیشہ یہی کمال نمایاں رہا (کم از کم میرے نزدیک) کہ وہ کسی سے دبنا نہ جانتے تھے۔ اس کی اور مثالیں بھی شاید آگے آئیں

پاکستان کی تحریک تیز ہونے پر خلیفہ عبدالحکیم عثمانیہ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر اس وقت کی حکومت کشمیر

میں ڈائرکٹر تعلیمات بن گئے تھے۔ ان سے پہلے خواجہ غلام السیدین اسی عہدے پر رہ چکے تھے لیکن خلیفہ صاحب کو یہ کام اور یہ عہدہ پسند نہ تھا۔ وہ ڈائرکٹری کے کام کو ہیڈ کلرکی سے موسوم کرتے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ حکومت کشمیر مسلمان ڈائرکٹر تعلیمات رکھ کر اپنے ڈھب کا کام کروانا چاہتی تھی۔ اس لیے خلیفہ صاحب جلد ہی وہاں سے لاہور آ گئے۔ مجھے انہیں قریب سے دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقعہ اسی زمانے میں ملا۔ اب پاکستان بھی بن چکا تھا۔ اور پاکستان کے مخصوص مسائل لوگوں کے سامنے آ رہے تھے اور سوچنے والوں کے دل و دماغ کو گرما رہے تھے۔ اس زمانے میں پہلے ان کی عزیزہ اور امرتسر کے مشہور بیرسٹر مسٹر سید حسن کی بیٹی ثریا (بیگم ذکا رحمت اللہ) کو ایم اے سائکالوجی میں داخل کروانے کے لیے گورنمنٹ کالج میرے پاس لائے اور پھر اپنی بیٹی رفیعہ (بیگم مسعود حسن) کو۔ یہ دونو نہایت ہی ذہین اور پر وقار طالبات ثابت ہوئیں اور دونو اس وقت عائلی زندگی کی ذمہ داریوں کے علاوہ سائکالوجی کی خدمت کا بار بھی اٹھائے ہوئے ہیں۔ ثریا کراچی یونیورسٹی میں لیکچرار اور کلینک کی انچارج ہیں اور رفیعہ سندھ یونیورسٹی حیدر آباد میں۔

خلیفہ صاحب کے فرزند عارف حکیم اس سے پہلے گورنمنٹ کالج سے ایم ایس سی پاس کر چکے تھے اور خلیفہ صاحب عارف کو بھی خود داخل کروانے آئے تھے اس وقت بھی وہ ہمارے اسٹاف روم میں کافی دیر تک بیٹھے رہے اور لطائف و ظرائف اور اپنی دلچسپ گفت گو سے حاضرین کو محفوظ کرتے رہے۔

عارف اور رفیعہ (بیٹے اور بیٹی) کے ذکر پر یہ بات بھی یاد آئی کہ ایک دفعہ میں نے خلیفہ صاحب کے سامنے عارف کی تعریف کی اور کہا کہ بالکل آپ کی طرح ہے۔ خوش شکل۔ ذہین وغیرہ تو اس کے جواب میں خلیفہ صاحب نے کہا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن میرا دماغ اور میرا علم رفیعہ کو ملا ہے

پاکستان کے بننے کے بعد جلد ہی یہ سننے میں آنے لگا کہ خلیفہ صاحب اسلام کے متعلق ایک کتاب کی تیاری میں مصروف ہیں۔ پہلے یہ سنا تھا کہ کتاب مختصر سی ہوگی، شاید رسالے کے برابر۔ لیکن جب کتاب شائع ہوئی تو اچھی خاصی ضخیم تھی۔ یہی وہ کتاب ہے جس سے خلیفہ صاحب کو پاکستان میں اور پاکستان کے باہر بڑی شہرت حاصل ہوئی اور جس کی وجہ سے وہ روشن خیال مسلمان مؤلفین اور مفکرین کی اس صف میں شامل ہو گئے جس میں سید احمد خاں۔ سید امیر علی۔ اور علامہ اقبال کھڑے نظر آتے ہیں۔ یہ نام ہمارے عظیم ترین ناموں میں سے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے درجہ اور ایک خاص قسم کی عظمت کا مالک ہے۔ خلیفہ صاحب کا بھی ایک خاص درجہ اور جداگانہ مرتبہ ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ان سب میں ایک بات مشترک ہے، اور وہ تقلید اور مروجہ خیالات سے آزادی ہے۔ خلیفہ صاحب نے ان جیسا مقام تو حاصل نہیں کیا لیکن ان سے بہت

کچھ نے کر اپنا ایک خاص مقام بنا لیا

خلیفہ صاحب کی کتاب اسلامک آئیڈیالوجی لبرل اسلام کی نمایندہ اور مؤثر تشریح ہے۔ کوئی اتفاق کرے یا نہ کرے (میں خود بھی اس تشریح سے پورا متفق نہیں)، لیکن لبرل اسلام ہمارے زمانے میں ایک خاص مکتب فکر ہے جس نے اسلام کے تعلق اور اس سے محبت اور اس کا احترام قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ جدید دنیا کے خیالات اور اس کے پیش کردہ چیلنج کو سمجھتے اور قبول کرتے ہوئے اسلامی تاریخ، اسلامی تعلیمات اور اسلامی ثقافت کی وضاحت کی ہے۔ اس طرز فکر کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ اس سے مسلمانوں کا نو تعلیم یافتہ طبقہ اسلام سے واقف ہو گیا اور اس طبقے کا جذباتی اور علمی تعلق اسلام سے قائم رہا۔ دوسرا فائدہ اس طرز فکر کا یہ ہوا کہ مغربی مولفین اور مفکرین کو بھی اسلام کے متعلق مسلمانوں کا نقطہ نظر بڑی حد تک معلوم ہو گیا۔ یہ دو فائدے ہمارے زمانے کے کسی اور مکتب خیال سے اس طرح حاصل نہیں ہو سکے جس طرح لبرل اسلام کے لٹریچر سے حاصل ہوئے

لبرل اسلام کیا ہے؟ لبرل اسلام دراصل اسلام کی ایک نرم قسم کی تشریح ہے جو اسلام کو مغرب کے لیے اور مغربی تعلیم اور مغربی افکار سے متاثر مسلمانوں کے لیے زیادہ قابل فہم بنا دیتی ہے اور یہ تشریح قابل قدر ہے کیونکہ اس کا فائدہ اسلام اور مسلمانوں اور مغرب اور مغربی افکار دونوں کو ہوا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ لبرل اسلام بعض مسائل میں بہت زیادہ نرمی سے کام لیتا ہے یا جدید خیالات اور جذبات سے زیادہ متاثر معلوم ہوتا ہے اور خلیفہ عبدالحکیم کے طرز فکر میں بھی اس کی کچھ مثالیں ملتی ہیں۔ اس کے باوجود خلیفہ عبدالحکیم کی تحریروں میں لبرل اسلام کے بہترین نقوش ملتے ہیں۔ جس کسی کو ان نقوش سے واقفیت پیدا کرنے کا شوق ہو (اور کسے ہوگا؟) اس کے لیے لازمی ہے کہ وہ خلیفہ صاحب کی تحریروں کا بغور مطالعہ کرے

خلیفہ صاحب کی ذہانت اور تقریر و تحریر کی قدرت ان کے علاوہ تھی۔ پاکستان کی فلاسفیکل کانگرس کی بنیاد رکھی گئی، پروفیسر میاں محمد شریف صاحب اس کے بانی مبانی اور روح رواں تھے۔ لاہور میں پہلا سشن منعقد ہونا قرار پایا۔ گویا لاہور میزبان تھا۔ اس لیے ضروری قرار پایا کہ اس سشن کا صدر کوئی لاہور سے باہر کا ہونا ضروری ہے۔ مشرقی پاکستان کے ڈاکٹر مختارالدین احمد صاحب کی طرف خیال گیا۔ انتظار کے بعد انہوں نے کوئی عذر پیش کر دیا۔ پھر مشہور ادیب، مقنن اور فلسفی مسٹر اللہ بخش خاں بروہی کو دعوت بھیجی گئی انہوں نے آمادگی کا اظہار کیا لیکن مشروط کر دیا۔ آخر جو شرط انہوں نے لگائی تھی (غالباً یہ شرط تھی کہ مجھے حکومت باہر امریکہ وغیرہ کسی کام پر انھی تاریخوں ہی نہ بھیج دے) وہ پوری ہوئی اور وہ بھی ہمارے ہاتھ سے نکل گئے اور دن بہت تھوڑے رہ گئے۔ آخر فیصلہ ہوا کہ اب بمجبوری فلاسفیکل کانگرس اگرچہ لاہور میں منعقد ہو رہی ہے اس کے پہلے سشن کا صدر اگر لاہور ہی کا باشندہ ہو

تو اس میں کوئی حرج نہیں خلیفہ عبدالحکیم صاحب کو دعوت دی گئی خیال نہ تھا کہ آپ اس قلیل وقت میں اپنا خطبہ صدارت لکھ دیں گے لیکن آپ نے نہ صرف ایک طویل خطبہ لکھ دیا بلکہ اتنے قلیل وقت میں لکھ دیا کہ ہم اسے چھپوانے اور معین موقعہ پر تقسیم کرنے میں کامیاب ہوگئے اور پاکستان میں فلسفہ کی ترویج اور فلسفیانہ تحقیقات کے فروغ کے لیے بعض نہایت ہی قیمتی تجاویز بھی پیش ہوگئیں۔ چنانچہ تاریخِ فلسفہ اسلام جو اس وقت پاکستان حکومت کی زیر نگرانی مرتب ہو رہی ہے اسی خطبہ کی ایک تجویز کا نتیجہ ہے

اسی قسم کی مثال گورنمنٹ کالج لاہور کی ایک کانوکیشن بھی ہے اس کے لیے بھی نہایت قلیل نوٹس پر خلیفہ صاحب کو ایڈریس کی دعوت دی گئی جو انہوں نے بلاحیل وحجت قبول کی اور سرعت سے اپنا خطبہ مرتب کرکے بھیج دیا

خلیفہ صاحب کی ذہانت اور قوت بیان کا مظاہرہ خطبات اور مقالات کے لکھنے تک ہی محدود نہ تھا اس کا مظاہرہ اس سے کہیں زیادہ ان کی برجستہ تقریروں میں ہوتا تھا۔ بسا اوقات ہماری فلاسفیکل کانگرس میں کوئی مذاکرہ بھی پروگرام میں رکھ دیا جاتا تھا۔ اور مقررین توسیعے بعد دیگرے کوئی نہ کوئی عذر کرکے تقریر سے گریز کر جاتے لیکن خلیفہ صاحب سے جب کہا جاتا تو وہ ہر وقت تیار پائے جاتے۔ اور اگر موضوع اقبال یا اقبالیات کی کوئی شاخ ہوتی تو پھر تو مذاکرے میں جان پڑ جاتی اور سننے والے نہ صرف سنتے بلکہ سر دھنتے

مجھے خلیفہ صاحب کی آخری تقریر سننے اور ان کی آخری تحریر دیکھنے بلکہ اس کا موجب ہونے کا موقعہ ملا۔ جنوری ۱۹۵۹ء میں کراچی میں ایک مذاکرے (سمنیار) کا انتظام ہوا، اسی قسم کا جیسا کہ اس سے پہلے لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کی زیر نگرانی ہوچکا تھا۔ مسلمان عالموں کے علاوہ یورپ امریکہ اور کینیڈا اور کچھ ممالک سیلون، سوڈان لبنان وغیرہ کے اسکالر بھی شریک ہوئے۔ اسلام اور دنیائے جدید کے تقاضے زیر بحث تھے۔ مختلف صورتوں میں بار بار یہی ہوتا کہ مغربی اسکالر اور مسلمان اسکالر ایک دوسرے کے مدمقابل بن کر تقریریں کرتے اور بحث میں اکثر مناظرے کا رنگ پیدا ہو جاتا۔ باوجود اس کے کہ خلیفہ صاحب ایک لبرل مسلمان سمجھے اور مانے جاتے تھے اور خود میں نے بھی انہیں لبرل مسلمان کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ہم نے یہ دیکھا کہ جہاں اسلام اور مسلمانوں پر کوئی غیر مسلمان (مغربی یا غیر مغربی) نکتہ چینی کی جرأت کرتا وہاں اس کے جواب میں خلیفہ صاحب ہی سب سے زیادہ آمادگی اور سب سے زیادہ جرأت دکھاتے۔ لندن کی خاتون پروفیسر لیمٹن نے اپنے مقالے میں کچھ اسی قسم کی باتیں کہی تھیں خلیفہ صاحب نے اس کا مضمون وہیں اجلاس میں دیکھا۔ میں خلیفہ صاحب کے ساتھ کی کرسی پر بیٹھا تھا اور میں نے بھی کچھ بے اختیار ہو کر کہہ دیا کہ مجھے اس مقالے سے دکھ ہوا ہے اور جی چاہتا ہے کہ اس کا جواب دیا جائے۔ پھر کیا تھا

خلیفہ صاحب اپنی باری پر اٹھے اور خوب مناظرانہ رنگ میں ترکی بہ ترکی جواب دیا جس سے طبیعت خوش ہو گئی خلیفہ صاحب کا یہی وصف ان کو باقی لبرل مسلمانوں سے ممتاز کرتا ہے۔ باقی لبرل مسلمان اگر معذرت خواہ قسم کے نہیں ہوتے تب بھی ان کا شوق تبلیغ اور شوق دفاع اتنا تیز نہیں ہوتا جتنا خلیفہ صاحب کا تھا۔ اس شوق کے ساتھ ان کے دل میں اسلام کے مستقبل کے متعلق ایک امید اور ایمان پایا جاتا تھا جو ان کے اسلامی جوش کو باقی لبرل مسلمانوں سے ممتاز کر دیتا

مذاکرے کے اسی اجلاس میں میں نے ایک رقعہ لکھ کر ان کے سامنے رکھا (مذاکرے کے ادب کی وجہ سے زیادہ باتیں کرنے کا موقعہ نہ تھا) میں نے لکھا تھا کہ وجود باری یا تصور باری تعالےٰ کے متعلق سید احمد خاں، علامہ اقبال اور خلیفہ عبدالحکیم کے تصور اور طرز فکر میں ایک باریک فرق ہے جس پر ایک مقالہ لکھا جانا چاہیئے اور یہ مقالہ خلیفہ صاحب کو ہی لکھنا چاہیئے۔ جب میں نے یہ رقعہ ان کے سامنے رکھا تو انہوں نے سر ہلایا اور کہا کہ نہیں۔ اگر لکھنا ہی ہے تو کوئی اور لکھے یا شاید مجھے کہا کہ تم لکھو، میں نے بھی سر ہلا دیا۔ اس پر انہوں نے رقعہ اٹھایا اور اس پر یہ شعر لکھ دیا۔ بازیچۂ کفر و دیں بہ طفلاں بسپار ۔ بگذر از خدا ہم کہ خدا ہم حریفیست

یہ شعر خلیفہ صاحب کی آخری تحریر ثابت ہوا۔ کیونکہ دوسرے روز وہ مذاکرے میں شریک نہیں ہوئے کیونکہ بعض ضروری ملاقاتوں کا پروگرام تھا۔ انہی ملاقاتوں میں مسٹر ممتاز حسن سکرٹری فنانس سے ملاقات بھی شامل تھی اور انہی کے دفتر میں خلیفہ صاحب نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

عبدالرحمن چغتائی

خلیفہ حکیم کا محلہ

میرے خیال میں علامہ اقبال کے بعد خلیفہ عبدالحکیم کی جگہ ہے۔ وہ مخصوص بصیرت کے مالک تھے اور علم وادب دین و حکمت کی دنیا میں انہوں نے جو نشانات چھوڑے ہیں وہ لافانی ہیں، ان کی عالمانہ حیثیت پر روشنی ڈالنے کے خیال سے ہی مجھے اپنی کم علمی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن خلیفہ حکیم میرے بچپن کے دوست اور ہمسایہ بھی تھے۔ ہم نے قریب قریب ایک ہی ماحول میں پرورش پائی ہے۔ اور ایک ایسے محلے میں اکٹھے رہے ہیں جس کی فضا ہمارے لیے شروع سے لے کر آخر تک مسموم تھی۔ اور میں نے خلیفہ صاحب کی زندگی کا یہ دور بھی دیکھا ہے۔

سوائے چند جانے پہچانے دوستوں کے جن کے ساتھ زندگی خوب گزرتی تھی ہمارے محلے میں کوئی اور دل کشی نہ تھی۔ وہ کچھ ایسا ماحول تھا جہاں کے رہنے والوں کو ہمارے جذبات کا خیال رکھنا گوارہ نہ تھا۔ وہ ایک ایسی فضا تھی جس میں ہمارے احساسات کو سمجھنے کی نہ کبھی کوشش کی گئی اور نہ ہمارا ساتھ دیا گیا۔ اس محلے میں ہونے والے حادثوں کو بھی ہماری نالائقی پر محمول کیا جاتا اور ہر موقع پر ہمیں مجرم ٹھہرایا جاتا تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہم اہل محلہ کے احساسات کا لحاظ نہیں رکھتے۔ اس عمر میں قوت برداشت کچھ اس درجہ ہوتی ہے کہ ہر بات آئی گئی کر دی جاتی ہے اور ہم بڑی بڑی باتوں کو بھی بچا جاتے تھے۔

خلیفہ حکیم بڑے آدمی ہوئے اور اس بڑائی کی علامتیں لڑکپن ہی سے ظاہر ہونے لگی تھیں۔ وہ ناموافق حالات سے دل برداشتہ نہ ہوتے اور بڑے بڑے واقعات کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ وہ اپنی ذہانت اور زندہ دلی کی وجہ سے اپنے تمام ساتھیوں میں ممتاز تھے۔ اور اس ماحول میں بھی اپنے دوستوں کا ایک حلقہ بنا لیا تھا جن سے وہ خوش گپیوں کے علاوہ کام کی باتیں بھی کرتے تھے۔ کم عمر دوستوں کے اس حلقہ میں وہ فرسودہ رسوم و عادات کی مذمت کرتے اور اس کھنڈر کو گرا کر تہذیب کی نئی شاندار عمارت بنانے کی ضرورت بیان کرتے۔ وہ حال کو مستقبل کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

زمانہ گذرتا گیا۔ یہاں تک کہ خلیفہ حکیم کی شادی ہو گئی۔ نہ تو خلیفہ حکیم رسم و رواج کے پابند تھے اور نہ بیگم حکیم کو پرانی رسمیں پسند تھیں۔ اور انہوں نے اس ماحول میں ایک بڑا جرأت مندانہ قدم اٹھایا۔ ایسے تنگ نظر ماحول اور وسیع محلے میں، جو خود ایک شہر کی حیثیت رکھتا ہے بیگم حکیم بے پردہ نکلنے لگیں۔ جب یہ دونوں گذرتے تو دیکھنے والے چہ می گوئیاں

کرتے۔ اپنی جہالت کا مظاہرہ کرتے جس کا برداشت کرنا آسان نہ تھا۔ خلیفہ حکیم پر تنقید کرنے والے وہ لوگ تھے جو ان کے پاؤں کی گرد کے برابر بھی نہ تھے۔ خلیفہ صاحب اپنے ارادے کے پکے تھے۔ جب کبھی اس کا ذکر آتا تو مسکراتے اور یہ کہہ کر چپ ہو جاتے کہ بھئی ہم جتنے آگے ہیں یہ لوگ اس سے کہیں زیادہ پیچھے ہیں"
ان لوگوں کے ذہنی انتشار اور ذہنی بیماریوں پر خلیفہ حکیم متاسف تھے اور ان کو ان سے پوری ہمدردی بھی تھی۔ وہ اس ماحول سے مایوس ہونے کے بجائے اس کو بدل دینا چاہتے تھے۔ میرے فن سے ان کو گہرا لگاؤ تھا اور ایک مرتبہ اپنی دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ "چغتائی! تم تو ان ذہنی بیماریوں سے متاثر نہیں ہو"۔ میں نے کہا کہ میں تو ایسا محسوس نہیں کرتا۔ کہنے لگے تو بس ٹھیک ہے ابھی تم کو بہت سے شاندار کام انجام دینے ہیں جن کا خود تمہیں تصور تک نہیں۔ اور ان کے یہ الفاظ میرے کانوں میں ہمیشہ گونجتے رہے۔ علم و حکمت کی دنیا خلیفہ حکیم کی منتظر تھی اور آخرکار ہم اپنی قدیم رہائش گاہوں کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن اس ماحول اور محلے کو چھوڑتے وقت نہ کوئی عظیم صدمہ محسوس کیا اور نہ اس سے جدا ہوتے ہوئے مسرت کے آنسو بہائے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

مرحوم ڈاکٹر خلیفہ کا حکیمانہ ادب

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ان اساتذہ کبار میں سے تھے جن کی تحریر اور تقریر، تصنیف و گفتگو یکساں طور پر علم و فکر سے لبریز و معمور تھی اور انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں برابر کی روانی و قدرت انہیں حاصل تھی۔ ان کا دائرۂ عمل بھی اسی طرح وسیع تھا اور ان کے موضوعات میں نتیجہ خیز تنوّع پایا جاتا تھا۔ فلسفہ ان کا موضوع اصلی تھا مگر فارسی اور اردو کی کلاسیکی اور نئی شاعری پر ان کو ایسا عبور حاصل تھا جو حیرت افزا تھا۔ پھر اقبالیات و اسلامیات میں ان کی تحقیق بذات خود اتنی پائدار اور عالمانہ تھی کہ ان مضامین میں بھی ان کو بلند مقام دیئے بغیر چارہ نہیں۔ مذہبی موضوعات پر انہوں نے تفکر اور اس میں سوچ کی نئی صورتیں پیدا کیں۔ چنانچہ ان کی فکریات کو جدید علم کلام کے سلسلے کی ایک اہم کڑی کہا جا سکتا ہے۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ وہ اردو کے شاعر بھی تھے اور فلسفیانہ نظم گوئی میں ان کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ صاحب کی جو کتابیں انگریزی میں ہیں ان پر اس مضمون میں بہ تفصیل گفتگو کرنا ممکن نہیں۔ مگر ان کا تذکرہ نظر انداز بھی نہیں ہو سکتا۔ ان کا اہم کام انگریزی کی کتاب اسلامک آئیڈیالوجی (ISLAMIC IDEOLOGY) اور اسلام اینڈ کمیونزم (ISLAM AND COMMUNISM) ہے۔ اوّل الذکر کتاب میں انہوں نے اسلامی عقائد و افکار کو نئی شعوریات کے ماحول میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اور دوسری میں کمیونزم کے اچھے اور بُرے پہلوؤں کا تجزیہ کر کے اسلام کو مسلک اعتدال قرار دیا ہے۔ اگر ڈاکٹر خلیفہ صاحب کے فلسفۂ مذہبی کا تجزیہ کیا جائے تو اس کا خلاصہ یہ ہوگا کہ وہ اسلامی تعلیمات میں سادگی اور فلسفیانہ معقولیت کے جویندہ تھے۔ عقل و الہام میں ارتباط ان کے نزدیک دائرۂ امکان کے اندر ہے۔ اور الہام یا وجدان بھی ان کے خیال میں شعور کی ایک برتر مختص النوع چیز ہے۔ چنانچہ عقل و الہام کی تفریق وجدانی ان کے نزدیک حقیقت ناشناسی کی علامت ہے۔

جیسا کہ آج کل یہ خیال عام ہے، اجتہاد کی ضرورت کو خلیفہ صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے مگر خلیفہ صاحب کا فلسفیانہ تعقل یا طریق کاروان کا رفیق و ہم سفر رہتا ہے۔ خلیفہ صاحب اجتہاد میں عقلی استعداد اور علمی بصیرتوں کو ضروری سمجھتے ہیں۔ جدید دنیا کا کوئی مجتہد سائنسی افکار کے علم فراواں کے بغیر مسندِ اجتہاد پر نہیں بیٹھ سکتا۔ اس سلسلے میں یہ بات کبھی کبھی کھٹکتی ہے کہ خلیفہ صاحب نے فکر اسلامی کے عظیم ماضی کے متعلق وسعت تحقیق پر اتنا زور نہیں دیا جتنا ضروری ہے —— اور یہ

طریق کار خلیفہ صاحب کے علاوہ چند اور فلاسفۂ مذہب نے بھی جدید دور میں اختیار کیا ہے۔ تاہم خلیفہ صاحب نے ان کے مقابلہ میں اعتدال و توازن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

فکریاتِ مذہبی میں (یعنی مذہب کا فلسفیانہ تجزیہ کرنے والوں میں) خلیفہ صاحب کا درجہ اس لیے بلند ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے طریق بحث میں تسہیل و تشریح کا ایسا ڈھنگ اختیار کیا ہے جس سے مغربی انداز میں سوچنے والا یا مغرب کا کوئی حقیقت طلب شخص مطمئن ہو سکتا ہے۔ یہ دراصل خلیفہ صاحب کی فلسفیانہ تعلیم و مطالعہ کا اثر ہے جس کی امداد سے وہ مذہب کی حقیقتوں کو کامیاب طریق سے واضح کر سکے ہیں۔ مگر ایسے طریق کار میں یہ کمزوری ضرور پیدا ہو جایا کرتی ہے کہ مذہب کے مابعد الطبیعاتی امور میں بھی جھکاؤ عقل کی طرف زیادہ ہو جاتا ہے۔

با ایں ہمہ خلیفہ صاحب کی مجرد عقل پسندی کے سامنے ایک صورتِ حال نے بند باندھ دیا۔ مرحوم اپنی آخری عمر میں فرمایا کرتے تھے کہ میں اب صوفی ہوتا جا رہا ہوں۔ ایک صوفی و فلسفی میں فرق یہی ہے کہ ایک مفکر صوفی بالآخر وجدان و ایمان کے سامنے ہتھیار ڈال دیا کرتا ہے اور نرا فلسفی آخری وقت تک منطق کے چکر میں پھنسا رہتا ہے۔ ولیم جیمز کے وارداتِ روحانی کے ترجمۂ اردو کے زمانے میں خلیفہ صاحب نے فلسفے کی صوفیانہ قسم سے (جو مذہب سے وابستہ ہے) کچھ زیادہ ہی وابستگی اختیار کر لی تھی۔ یوں اس کے علاوہ بھی فارسی اردو کے صوفی شاعروں سے ان کو عقیدت تھی۔ اور فلسفہ کے عارفانہ طریق تفکر کے پہلے سے بھی قائل تھے۔ فلسفیانہ مسلک میں وہ اس IDEALISM یعنی مثالیت یا عینیت کے دلدادہ تھے جس کو اختیار کرنے کے بعد ایک فلسفی اور ایک مومن میں بہت کم فرق رہ جاتا ہے۔

میں خود فلسفے کا طالب العلم نہیں ہوں اس لیے خلیفہ صاحب کے فلسفیانہ کام کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ کام کسی فلسفی کا ہے مگر میں انہیں صوفی فلسفی کی حیثیت سے جاننے کا قدرے مدعی ہوں۔ اور اس دعوی کا سبب میرا وہ مطالعہ ہے جو میں نے ان کے سلسلۂ رومیات کے متعلق کیا ہے۔

رومی سے خلیفہ صاحب کا تعلق بلا واسطہ بھی ہے اور اقبال کے واسطے سے بھی ہے۔ ان کی ایک کتاب حکمتِ رومی پرانی ہے اور تشبیہاتِ رومی آخری زمانے میں لکھی ہوئی چیز ہے۔ حکمتِ رومی اگرچہ رومی کے اسرار کو آشکار کرنے کی سعی ہے مگر اس میں بھی خلیفہ صاحب کا اپنا میلانِ فکر نمایاں ہو جاتا ہے۔ مثنوی رومی کو قرآں در زبانِ پہلوی قرار دیا گیا ہے اور اس معنے میں اس میں قرآن اور دین ہی کے معارف بیان ہوئے ہیں۔ مگر خلیفہ صاحب کا طریق کار یہ بتاتا ہے کہ وہ رومی کے افکار کے عقلی عنصر کو نمایاں کر رہے ہیں۔ چنانچہ ایک مقام پر لکھا ہے:

"استقرائی اور استدلالی علم ایک تنظیمی قوت ہے، محسوسات و مظاہر و حوادث میں ربط تلاش کرتی ہے کائنات کے تمام مدارج میں نظم موجود ہے، اس لیے ہر درجے میں اس درجے کی عقل پائی جاتی ہے...."

اولیائے کرام نے عقلِ نبوی اور عقلِ ایمانی کا بھی ذکر کیا ہے۔"

اس طرح ان کے یہاں عقل کی برتری یا احاطۂ کلی کی ایک صورت نمایاں ہے ـــــ خیر اس کو عقل کہیئے یا ایمان (ناموں میں آخر کیا پڑا ہے) خلیفہ صاحب نے رومی کے عقلی عنصر کو ان کے ایمانی عنصر کے ساتھ تطبیق دی ہے اور اس طرح مولانا روم کا از سرِ نو مطالعہ کیا ہے۔ رومی کی تشبیہات میں بھی یہی طریق کار اختیار کیا گیا ہے۔ اور رومی کے تمثیلی استقرا کی خوبی بیان کرتے ہوئے اس کی عقلی حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔

رومی پر خاص توجہ کرنے والوں میں شبلی اور اقبال دونوں کا درجہ بلند ہے۔ اقبال نے رومی کے فلسفۂ عشق کو خاص طور سے ابھارا ہے۔ مگر خلیفہ صاحب نے رومی کی عقلیات کی خاص تنظیم کی ہے جھکاؤ عقل کی طرف زیادہ ہے۔ یہ تنظیم شبلی کے تجزیہ رومی سے کہیں زیادہ باخبرانہ ہے کیونکہ شبلی فلسفے کے جدید نظاموں سے بالواسطہ شناسائی رکھتے تھے اور ڈاکٹر خلیفہ اس کے ماہرین میں سے تھے۔

تشبیہاتِ رومی اگرچہ بظاہر رومی کی تشبیہات ہی سے متعلق ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو یہ حکمتِ رومی کی وسیع تر تشریح کی منظم صورت ہے جس میں شواہد کی موجودگی سے کتاب زیادہ مستند ہو گئی ہے۔

اب میں اقبالیات کی طرف آتا ہوں۔ خلیفہ صاحب مرحوم اقبال کے خاص مداحوں میں شامل تھے، مگر ان کو ان کے ناقدوں میں بھی ایک بلند مقام حاصل ہے۔ فکرِ اقبال میں مرحوم نے فکرِ اقبال کے اہم اجزا سے الگ الگ بحث کی ہے۔ اور ان کے خطبات کا ترجمہ بھی پیش کیا ہے۔ تنقیدِ اقبال کے سلسلے میں عام طور سے یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ اقبالیات کی کتابوں میں خلیفہ صاحب نے فکرِ اقبال کی توسیع کی ہے جس کو مصنف کے خیالات پر ایک توسیعی حاشیہ کہا جا سکتا ہے۔ میں نے فکرِ اقبال کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کو بار بار پڑھا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ یہ الزام علی العموم صحیح نہیں کیونکہ یہ تو واضح ہے کہ ایک ناقد کسی مصنف کے سلسلے میں اپنے نتائجِ فکر یا اپنے ہی تاثرات کو پیش کیا کرتا ہے۔ اس لیے اس کو تنقید میں اپنے نتائج کو پیش کرنے کا پورا اختیار رہے، بدیں وجہ مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں کہ فکرِ اقبال میں خلیفہ صاحب کے اپنے خیالات زیادہ ہیں اور اقبال کے کم۔ البتہ مغربی تمدن کے سلسلے میں اقبال کے خیالات کی جو تشریح ہوئی ہے اس میں مجھے شائبہ تاویل ضرور نظر آتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس علمائے قدیم کے متعلق اقبال اور خلیفہ صاحب کے خیالات میں بڑا فرق ہے۔ مگر فکرِ اقبال میں خیالات کچھ اس طرح مل جل گئے ہیں کہ ان کو الگ تھلگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس معمولی سے واقعہ کے باوجود فکرِ اقبال حکیمِ مشرق پر شاید سب سے وقیع ترین کتاب ہے۔ کیونکہ اس میں ناقد ایک فلسفی بھی ہے اور متفکر مذہبی بھی ہے اور ان دو شرطوں کو پورا کیے بغیر کوئی شخص اقبال کا صحیح ناقد بن نہیں سکتا۔

افکارِ غالب کو میں ایک فلسفے کی کتاب مانتا ہوں اگرچہ وہ مربوط فلسفے کی کتاب نہیں۔ غالب بڑے شاعر تو تھے

مگر ان کے یہاں حقائق فلسفیانہ بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ غالب کی نفسیاتی ژرف نگاہی کو ان کے سب ناقدین تسلیم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر خلیفہ صاحب کی فلسفیانہ نظر نے اس مواد کو جانے نہیں دیا اور غالب کے فلسفیانہ افکار کو مربوط طریق سے پیش کر دیا ہے اور ان کے خیالات سے ایک با قاعدہ نظامِ فکر مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ تشبیہات رومی کی طرح افکارِ غالب میں ایک خوبی اور ایک کمزوری ہم رکاب ہیں۔ خوبی تو یہ ہے کہ غالب کے فلسفیانہ خیالات کا مواد اور ان کے شواہد یک جا ہو گئے ہیں مگر کمزوری یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں مربوط کتابیں نہیں بن سکیں بلکہ ان کا درجہ کم و بیش تشریحات کا ہو گیا ہے۔ تشریحی مواد زیادہ ہے اور تنقیدی مواد کم۔ مگر اس سوال کا جواب بھی آسان نہیں کہ ہماری زبان میں اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب کونسی ہے؟ شاید کوئی نہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب خواجہ میر درد کے افکار کو بھی اسی انداز میں مرتب کر جاتے تو ہماری زبان کا سرمایۂ فکری وقیع تر ہو جاتا۔ افسوس کہ ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔

میں اس موقع پر خلیفہ صاحب مرحوم کے مضامین سے بحث نہیں کروں گا۔ البتہ مجھے ان کے اندازِ بیان کے متعلق ضرور کچھ عرض کرنا ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ کے اسلوبِ بیان کی ممتاز ترین صفت اس کی وہ غیر معمولی سلاست ہے جس کی وجہ سے ان کی تحریر دل پذیر، مشکل اور دقیق فلسفیانہ مطالب نہ صرف آسان ہو گئے ہیں بلکہ دلچسپ اور دلکش بھی ہو گئے ہیں۔ بہت کم مصنف اردو میں ایسے ہوں گے جن کے یہاں علم اور خوبیٔ انشا کا اتنا اچھا امتزاج ملتا ہو گا۔

ڈاکٹر خلیفہ کی مدرسانہ زندگی کا ان کے اسلوب پر گہرا اثر نظر آتا ہے۔ وہ اثر ہے ان کا تشریحی اندازِ بیان۔ وہ ہر مسئلے کی اتنی تشریح در تشریح کرتے ہیں کہ کوئی مشکل، مشکل ہی نہیں رہتی۔ جن لوگوں نے خلیفہ صاحب سے ملاقات کی ہے انہیں ان کی کتابیں پڑھ کر یہی محسوس ہوتا ہے گویا خلیفہ صاحب کسی مجلس میں گفتگو کر رہے ہیں۔

ان کی تحریروں میں لطائف و اشعار کا استعمال اتنا برمحل ہوتا ہے کہ ان کتابوں سے عمدہ اشعار کا ایک معقول انتخاب تیار ہو سکتا ہے۔ ان کے لطائف میں ان کی ظرافت کا رنگِ خاص اور ان کے اشعار میں ان کے ذوقِ ادبی کی دل کش تصویر جلوہ آرا ہے۔

لطائف و اشعار سے ان کی تحریر کو فائدہ بھی پہنچا ہے اور نقصان بھی۔ بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ بعض اوقات تحریر میں طوالت بے جا کا عیب پیدا ہو گیا ہے۔ مگر یہ فائدہ بھی ہوا ہے کہ لوگ ان کے فلسفیانہ مضامین و تصانیف کو دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔

مجھے ان کی فلسفیانہ نثر میں سب سے زیادہ ان کی کتاب داستانِ دانش سے دلچسپی ہے۔ اس میں طوالت، اطناب، تشریحی لطیفہ بازی، اشعار کے اضافے کم سے کم نظر آتے ہیں اور حکمت اور انشا پردازی کا ایسا اجتماع پیدا ہو گیا ہے جو مصنف کو بیک وقت اچھا انشا پرداز اور اچھا فلسفی ثابت کر رہا ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ کو فکرِ اسلامی سے بھی انہماک تھا اور ادبِ فارسی و اردو سے بھی۔ اور انہوں نے ان دونوں مقاصد کی تکمیل کی کوشش کی۔ ان کی تصانیف سے جہاں اسلامی فکریات کے متعلق سوچ کی نئی راہیں کشادہ ہوئیں وہاں اردو ادب کی ثروت میں بھی بیش بہا اضافہ ہوا۔ انہوں نے ادب و حکمت میں وہ رابطہ پیدا کیا جس کا خواب شبلی نے دیکھا تھا۔ مگر نثر اردو میں اس کی تعبیر خلیفہ عبدالحکیم کے ماسوا کوئی نہ کر سکا۔ البتہ شعر و حکمت کی یک جائی کے لحاظ سے، اعلی اللہ مقامہٗ حکیم مشرق اقبال کا مقام لاثانی اور لافانی ہے۔

مطبوعاتِ بزمِ اقبال ومجلسِ ترقیِ ادب

مجلّۂ اقبال سہ ماہی۔ مدیر: ایم۔ ایم شریف۔ بشیر احمد ڈار۔ سالانہ دس روپے۔

صحیفہ سہ ماہی۔ مدیر: سید عابد علی عابد۔ سالانہ دس روپے۔

کتاب	مصنف / مترجم	روپے
میٹافزکس آف پرشیا۔	مصنفہ علامہ اقبال	۵ — ۰ — ۰
امیج آف دی وسٹ ان اقبال۔	مصنفہ مظہر الدین صدیقی	۲ — ۰ — ۰
اقبال اینڈ والنٹرزم۔	مصنفہ بشیر احمد ڈار	۶ — ۰ — ۰
فکرِ اقبال۔	مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	۱۰ — ۰ — ۰
ذکرِ اقبال۔	مصنفہ عبدالمجید سالک	۵ — ۰ — ۰
علامہ اقبال۔	مترجمہ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم	۱ — ۸ — ۰
شعرِ اقبال۔	مصنفہ سید عابد علی عابد	۷ — ۸ — ۰
اسلام اور تحریکِ تجدد مصر میں۔	مترجمہ عبدالمجید سالک	۵ — ۰ — ۰
غیب وشہود۔	مترجمہ سید نذیر نیازی	۳ — ۴ — ۰
حکمتِ قرآن۔	مترجمہ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم	۱ — ۰ — ۰
جمالیات قرآن کی روشنی میں۔	مصنفہ نصیر احمد	۴ — ۰ — ۰
فلسفۂ شریعتِ اسلام۔	مترجمہ ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ	۵ — ۰ — ۰
نظامِ معاشرہ اور اسلام۔	مترجمہ عبدالمجید سالک وعزیز	۴ — ۰ — ۰
دولتِ اقوام ۳ جلد۔	مترجمہ عطاء اللہ وفخری	۳۶ — ۰ — ۰
سائنس سب کے لیے۔	مترجمہ آفتاب حسن	۲۰ — ۰ — ۰
فلسفۂ جدید۔	مترجمہ شکار حسین	۲ — ۰ — ۰
فلسفۂ ہند ویونان۔	مصنفہ محمد شفیق	۳ — ۰ — ۰
تاریخِ اقوامِ عالم۔	مرتبہ مرتضےٰ احمد خاں	۱۰ — ۰ — ۰

ملنے کا پتہ: سیکریٹری بزمِ اقبال ومجلس ترقی ادب۔ نرسنگداس گارڈن۔ لاہور

پروفیسر حمید احمد خاں

خلیفہ صاحب کی علمی زندگی

۲۴ جنوری ۱۹۵۹ء کی شام کا ذکر ہے کہ وارث روڈ (لاہور) کے ایک پُرسکون مکان میں چند اہلِ علم اور کچھ اہلِ ذوق لوگ شام کے کھانے پر جمع تھے۔ مجمع مختصر تھا مگر منتخب، اور منتخب کیوں نہ ہوتا جب میزبان ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم تھے۔ خلیفہ صاحب کے مہمان نام کو دعوتِ طعام پر مگر دراصل خلیفہ صاحب کے لطفِ کلام سے بہرہ اندوز ہونے کے لیے یہاں پہنچے تھے۔ موضوعِ گفتگو اس قسم کے سوالات تھے کہ تصوّف کیا ہے؟ تصوّف اور دین میں کیا رشتہ ہے؟ سائنسی انکشافات کی روشنی میں تصوّف کے واردات کی کیا حقیقت ہے؟۔۔۔۔ یہ اور اس قسم کے اور بحث سے سوالات کئے گئے مگر اس خصوصیت کے ساتھ کہ ہر ایک سوال کا رُخ صاحبِ خانہ کی طرف تھا۔ خلیفہ صاحب نے ان مسائل پر روشنی ڈالنے کے لیے بڑی مبسوط، بڑی مدلّل، بڑی حکیمانہ تقریر کی۔ پوچھنے والے اور سمجھانے والا دونوں فریق ایک استغراق کے عالم میں تھے۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔۔۔ ڈیڑھ گھنٹہ۔۔۔۔ ڈھائی گھنٹے۔۔۔۔ علم و فضل کا چشمہ اس طرح اُبل رہا تھا جیسے وقت کی رفتار معدوم اور مادّی دنیا کے ہنگامے محض باطل ہیں اور حقیقی وجود ہے تو صرف علم کے نور کا۔ آدھی رات سے کچھ پہلے یہ محفل برخاست ہوئی تو ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے مہمان ان سے نہیں خود اپنے آپ سے ایک سوال کر رہے تھے: کیا ایک ہزار برس پہلے عہدِ عباسیہ کے بغداد کے علماء اسی رنگ میں اپنی مجلسیں قائم نہیں کرتے تھے؟ کیا ڈھائی ہزار برس پہلے یونان کے فلسفی اپنی فراست کا فیضان اسی لہجے میں اہلِ ذوق کو نہیں پہنچاتے تھے؟ اور اس سوال کا جواب ہر شخص خود بخود اثبات میں دے رہا تھا۔ سچ یہ ہے کہ سات روز پہلے کی وہ شام خلیفہ صاحب کے ذہن کی بلندی اور گہرائی اور ان کی گفتگو کی روانی اور برجستگی دہ رہ کر خود اپنے آپ پر سبقت لے جا رہی تھی۔

اُس ہمیشہ یاد رہنے والی شام کو ابھی پورا ایک ہفتہ نہیں گزرنے پایا تھا کہ دنیا کی بے ثباتی نے اعلان کیا کہ علم و حکمت کا آفتاب غروب ہو گیا۔ زندگی کی مضطرب لہر ایک دم ساحل سے لگ کر سو گئی، تبسّم کی ہلکی سی لرزش ان ہونٹوں پر جم کر رہ گئی جو انسانی بات چیت کے لیے اب کبھی حرکت میں نہ آئیں گے ـــــ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ۲۶ جنوری کو اسلام کے متعلق ایک علمی مذاکرے میں شرکت کے لیے لاہور سے کراچی روانہ ہوئے۔ کراچی پہنچ کر وہ حسبِ معمول ملاقاتوں لطیفوں اور نکتہ سنجیوں میں گھرے رہے۔ اسی حالت میں ۳۰ جنوری کو دن کے ایک بجے انہیں دل میں کچھ گھبراہٹ سی معلوم ہوئی۔

اور سوا نبجے وہ تمام گھبراہٹوں کی آلائش سے پاک ہو کر صرف اپنے نفسِ مطمئنہ کو لیے ہوئے دارالبقا میں جا پہنچے۔

خلیفہ عبدالحکیم خود اپنے قول کے مطابق ۱۸۹۴ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خلیفہ عبدالرحمن پشمینے کے تاجر تھے اور اپنی اولاد میں خلیفہ عبدالحکیم کو ان کی ذہانت اور شوقِ مطالعہ کے باعث سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ عبدالحکیم شیراں والے دروازے کے اسلامیہ ہائی سکول میں داخل ہوئے۔ یہاں عمر کے بارھویں برس میں تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ اسی مدرسے سے ۱۹۱۱ء میں پنجاب یونیورسٹی کا میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اسی سال علی گڑھ جا کر ایف۔ اے میں داخل ہوئے۔ اس وقت تک انہیں تقریر کا بہت اچھا ملکہ حاصل ہو چکا تھا۔ ابھی سال اوّل میں تھے کہ ایم۔ اے۔ او کالج کے ایک تقریری مقابلے میں حصہ لیا۔ اس مقابلے میں بی۔ اے کے طلبہ بھی شامل تھے مگر خلیفہ عبدالحکیم کو پہلا انعام حاصل ہوا۔ ۱۹۱۳ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایف۔ اے کے امتحان میں کامیاب ہو کر دلّی چلے گئے۔ اب انہیں فلسفے سے انتہائی شغف پیدا ہو چکا تھا اور فلسفے کا حسبِ دلخواہ استاد سینٹ اسٹیفنز کالج دلّی میں تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں سینٹ اسٹیفنز کالج سے پنجاب یونیورسٹی کا بی۔ اے اور بعد میں اسی کالج سے فلسفے میں ایم۔ اے کیا۔ ان کے ایم۔ اے کے ممتحنوں میں علامہ اقبال بھی ایک ممتحن تھے اور خلیفہ صاحب ہمیشہ اس بات پر فخر کرتے رہے کہ اس خاص پرچے میں انہوں نے اونچے نمبر پائے تھے۔

دلّی سے ایم۔ اے کر کے خلیفہ عبدالحکیم لاہور چلے آئے۔ یہاں آ کر انہوں نے ایل ایل۔ بی کی سند حاصل کی۔ مگر وکالت کا کام شروع نہیں کیا۔ کچھ عرصہ خواجہ احمد شاہ کے انگریزی اخبار "پنجاب آبزرور" کی ادارت سے منسلک رہے۔ ابھی وہ کسی مستقل کام کی تلاش ہی میں تھے کہ اگست ۱۹۱۹ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کالج قائم ہوا۔ اور وہ اسی کالج میں فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو کر حیدر آباد دکن چلے گئے۔ اس کے بعد ان کی زندگی کا بہت بڑا حصہ وہیں گزرا۔ لیکن بیچ میں مختلف قسم کے وقفے بھی آتے رہے۔ سب سے پہلے وہ ۱۹۲۲ء میں یورپ گئے۔ یہاں انہوں نے فلسفۂ رومی پر تحقیقی کام کیا اور ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم بن کر حیدر آباد واپس آئے اور واپسی پر عثمانیہ یونیورسٹی کالج کے پروفیسر اور صدر شعبۂ فلسفہ مقرر ہوئے۔

یورپ سے واپس آنے کے بعد خلیفہ صاحب نے اٹھارہ برس کا عرصہ علمی اور تعلیمی مشاغل میں صرف کیا۔ جو لوگ اس زمانے میں ان کے درس سے فیض یاب ہوئے اُن میں شامل ہونے کی عزت مجھے بھی حاصل ہوئی۔ بی۔ اے میں تاریخِ فلسفہ کا بڑا حصہ میں نے خلیفہ صاحب سے پڑھا۔ اسی زمانے میں انہوں نے ویبر کی "تاریخ فلسفہ" کا اُردو ترجمہ کیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم اُردو تھا۔ اسی لیے خلیفہ صاحب کے لکچر اردو میں ہوتے تھے۔ لیکن اردو کی درسی کتاب میں نے کبھی اُن کے سامنے نہیں دیکھی۔ مجھے کانٹ پر ان کے لکچر خصوصیت سے یاد ہیں THE CRITIQUE

CRITIQUE OF PURE REASON کا اصل جرمن ایڈیشن ان کے سامنے پڑا رہتا تھا۔ جرمن عبارت کو وہ برجستہ اردو میں منتقل کر کے کانٹ کے مطلب کی تشریح کرتے تھے اور اس تشریح میں ایک خاص لطف یہ ہوتا تھا کہ خلیفہ صاحب نہ صرف کانٹ میں بلکہ خود اپنے آپ میں ڈوب کر بات کرتے تھے۔ رومی اور سعدی، حافظ، غالب اور اقبال کے بے شمار اشعار انہیں یاد تھے۔ کانٹ کے مابعد الطبیعی فلسفے کی شرح "در حدیثِ دیگراں" سُن کر ایک عجیب کیفیت پیدا ہوتی تھی اور خود خلیفہ صاحب اس کیفیت میں سرشار نظر آتے تھے۔

سنہ ۱۹۴۳ء میں خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے حیدرآباد دکن سے عارضی رخصت لی اور عثمانیہ یونیورسٹی میں اپنی واپسی کا حق برقرار رکھ کر کشمیر چلے گئے۔ یہاں پہلے امر سنگھ کالج سری نگر کے پرنسپل اور پھر ریاست کے ناظم تعلیمات مقرر ہوئے خلیفہ صاحب کا ارادہ کشمیر میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا تھا چنانچہ انہوں نے سری نگر میں نسیم باغ کے قریب اپنے لیے ایک مکان تعمیر کیا۔ لیکن جس طرح آباؤ اجداد ہجرت کر کے لاہور پہنچے تھے اسی طرح خلیفہ صاحب نے بھی سنہ ۱۹۴۶ء میں کشمیر سے ہجرت کی اور دوبارہ حیدرآباد دکن آ گئے۔ سنہ ۴۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے میر شعبۂ فنون (DEAN OF THE FACULTY OF ARTS) مقرر ہوئے۔ سنہ ۴۹ء میں پاکستان چلے آئے۔

سنہ ۴۹ء سے سنہ ۵۹ء تک ان کی زندگی کا آخری اور شاید سب سے زیادہ گراں بہا دور ہے۔ انہوں نے لاہور میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ قائم کیا اور اس ادارے کی تنظیم و ترقی میں کوشاں رہے۔ اس دوران میں ان کے قلم سے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں نہایت بلند پایہ علمی و ادبی کتابیں نکلیں۔ ISLAMIC IDEOLOGY خصوصیت سے مقبول ہوئی۔ فکرِ اقبال اس خاص موضوع پر ہمیشہ مستند کتاب مانی جائے گی۔ افکارِ غالب نے غالب کے مضامین کی شرح ایک نئی طرز پر کی۔ حکمتِ رومی مولانائے روم کے افکار اور نظریات کی بڑی دلکش اور حکیمانہ تشریح ہے۔ خلیفہ صاحب نے ولیم جیمز کی VARIETIES OF RELIGIOUS EXPERIENCE کا شستہ ترجمہ بھی بڑی محنت سے مکمل کر کے شائع کیا۔

عالم فکر و تحریر کی ان کاوشوں کے ساتھ دینی، عملی اور قومی خدمت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ فقہی مسائل پر حکومت کی طرف سے جو کمیشن مقرر ہوتے رہے خلیفہ عبدالحکیم صاحب اپنے تفقہ، تحکیم اور وسیع النظری کی بنا پر ان میں شامل کیے جاتے رہے اور مفید خدمات انجام دیتے رہے۔ ثقافتی خطبات دینے کے لیے امریکہ بھیجے گئے اور کامیاب واپس آئے۔ اس عرصے میں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کے عہدے کی پیشکش دو تین مرتبہ ہوئی۔ لیکن اپنے علمی مشاغل کے ساتھ اس منصب کے فرائض کو ہم آہنگ کرنا خلیفہ صاحب کو مشکل نظر آیا۔ سنہ ۱۹۵۷ء کے کانووکیشن میں یونیورسٹی نے انہیں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی اور حقیقت یہ ہے کہ اس طرح خود اپنا وقار بڑھایا۔

خلیفہ عبدالحکیم صاحب بطور ایک عالم کے وسعتِ مشرب کے لیے اپنی مثال آپ تھے۔ دین اسلام سے دلی محبت رکھنے کے باوجود دوسرے مذاہب کی خوبیوں کے منکر نہ تھے۔ سچے پاکستانی تھے مگر دنیا کے تمام ممالک کے لیے ہمدردانہ جذبہ رکھتے تھے۔ اُن کی انسان دوستی اور سلامت طبع کا یہ عالم تھا کہ کٹر ملائیت اور حد سے بڑھی ہوئی مغرب پسندی دونوں کبھی کبھی ان کے مسلک پر ناک بھوں چڑھاتی تھیں۔ لیکن وہ ایک آفاقی شخصیت تھے، جسے ان جھگڑوں سے سروکار نہ تھا :

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی

خلیفہ صاحب کی ہمہ دانی، ہمہ گیری، ہمہ شناسی کے سامنے ان کی ذاتی محبت و شفقت کبھی ماند نہ پڑی۔ اتنی گہری علمیت کے ساتھ اتنی شفقت شاذ و نادر جمع ہوتی ہے۔ بہت کم لوگوں نے ان کو غصے کی حالت میں دیکھا۔ ان کا تبسم ان کی فطرت کا ایک بنیادی رنگ تھا اور ان کی خوش مزاجی سے بعض دفعہ لوگ گھبرا اٹھتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خلیفہ صاحب کو انسان دوستی اور خیر سگالی کا ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ ملا تھا جسے وہ بڑے اسراف سے لٹاتے تھے لیکن اس میں پھر بھی کمی نہ آتی تھی۔

بشیر احمد ڈار

خلیفہ صاحب کی علمی خدمات

خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کشمیریوں کے ایک متوسط خاندان میں گیارہ جولائی ۱۸۹۴ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا جو کشمیر سے ہجرت کر کے لاہور میں آباد ہوئے تھے پشمینہ کا کام کرتے تھے۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا اور ان کی وابستگی کا مرکز چینیانوالی مسجد تھی۔

خلیفہ صاحب نے ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد دو سال تک علیگڈھ میں تعلیم پائی اور پھر سینٹ سٹیفن کالج دہلی میں داخل ہوئے جہاں سے انہوں نے ۱۹۱۷ء میں فلسفہ میں ایم۔ اے کیا اور پنجاب بھر میں اول رہے۔ امتحان میں انہوں نے جو مقالہ پیش کیا وہ رومی کے فلسفہ سے متعلق تھا جس کی ایک کاپی پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ ۱۹۱۹ء میں انہوں نے ایل ایل۔ بی پاس کیا اور اسی سال عثمانیہ یونیورسٹی میں بطور لیکچرار فلسفہ ان کا تقرر ہو گیا۔ ۱۹۲۲ء میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ گئے اور ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ ڈی حاصل کی۔ ان کا مقالہ "مابعد الطبیعیاتِ رومی" مولانا روم کے فلسفہ پر بہترین کتاب ہے جو بعد میں ۱۹۳۳ء میں پہلی بار لاہور سے شائع ہوئی۔ ان کی عمر کا بہترین حصہ حیدرآباد دکن کی علمی فضا میں گزرا جہاں وہ سیاست سے بالکل الگ تھلگ علم کی تحصیل و ترویج میں مشغول رہے۔ ۱۹۴۳ء میں وہ ریاست جموں اور کشمیر میں بطور ڈائرکٹر تعلیمات مقرر ہو کر گئے۔ لیکن جلد حیدرآباد واپس پہنچ گئے جہاں سے وہ ۱۹۴۶ء میں ریٹائر ہو گئے۔

خلیفہ مرحوم نے فیصلہ کیا کہ باقی ماندہ زندگی کشمیر کے پُرفضا ماحول میں بسر کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے نسیم باغ میں کافی وسیع و عریض زمین خرید کر ایک دلکش بنگلہ تعمیر کرایا۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد سیاسی حالات بگڑنے کے باعث وہ لاہور میں آکر آباد ہو گئے۔ بعد میں جب کبھی وہ اس ترک مکانی کا ذکر کرتے تو انہیں اس مکان کے نقصان سے زیادہ اس لائبریری کے ضائع ہونے کا غم تھا جس کو وہ اپنی ساری علمی زندگی کا سرمایہ سمجھتے تھے۔

مسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان کا صحیح اور اصلی مقصد یہ تھا کہ اسلامی نظریات کو عملی شکل دینے کی کوشش کی جائے اس مقصد کے حصول کے لیے بقول اقبال تطہیر فکر کی انتہائی ضرورت تھی۔ مغربی علوم کی ترویج سے مسلمان نوجوان کا ذہن لادینیت سے مسموم ہو چکا تھا اور اس لیے اسلام کی قدیم تعبیر اس کے لیے بے کار ہو چکی تھی۔ اسلام کی خوبیوں کے نظری

اعتراف کے باوجود وہ اس کے عملی فوائد سے مایوس ہو چکا تھا۔ اس ذہنی انقلاب کو پیدا کرنے کے لیے لاہور میں ۱۹۵۰ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کی بنیاد رکھی گئی اور اس کے پہلے ڈائرکٹر خلیفہ عبدالحکیم مقرر ہوئے۔ انہوں نے اس عظیم الشان مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے سب سے پہلے انگریزی میں ایک کتاب "اسلام کا نظریۂ حیات" لکھی۔ یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے پاکستان میں سب سے پہلی کامیاب کوشش تھی جس میں اسلام کے بنیادی اصولوں کو جدید فکر و فلسفہ کی روشنی میں پیش کیا گیا تھا۔ اس کی زبان بالکل سادہ تھی اور اس کا اولین مخاطب وہی مغربی تعلیم یافتہ گروہ تھا جس کے قلب کے اندر اسلام سے وابستگی ضرور موجود تھی لیکن جو اسے جدید سائنسی طرزِ فکر کی اصطلاحات کے بغیر عقلی طور پر ماننے کے لیے تیار بھی نہ تھا۔ اسلامی اصولوں کی بنیاد پر جو اخلاقی، اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی تخیلات اور عوامل بروئے کار آسکتے تھے ان کی بھی تفصیلی وضاحت کر دی گئی۔

لیکن جدید زمانے میں نہ صرف اسلام بلکہ ہر ایسے نظام فکر کے لیے جس کی بنیاد خدا پر ایمان اور چند اخلاقی اور روحانی اقدار کے اقرار پر مبنی ہے اشتراکیت سے بڑھ کر کوئی بڑا خطرہ نہیں۔ اشتراکیت خدا اور روحانی و اخلاقی اقدار کے مکمل انکار کے ساتھ ساتھ انسان کے عقلی اور ارادی پہلو کو پورے طور پر معاشی عوامل کا پابند بنا کر اس کی انفرادی آزادی کو ختم کر دیتی ہے۔ چنانچہ اس کتاب کے آخری باب میں خلیفہ صاحب نے اشتراکیت اور اسلام کا موازنہ کرکے اول الذکر کی خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ مگر اس موضوع کی وسعت اور اشتراکیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے پیش نظر جلد ہی انہوں نے ایک علاحدہ مفصل کتاب "اسلام اور اشتراکیت" کے نام سے انگریزی میں لکھی۔ اس میں انہوں نے اشتراکیت کے بنیادی نظریات کا معروضی طور پر جائزہ لیا اور اس کے مابعد الطبیعی، اخلاقی اور معاشی نتائج کو روسی معاشرے کی تشکیل کی عملی شکل میں پیش کرکے اس کی کمزوریوں کی نشاندہی کی۔ اس کے بعد اسلام کے معاشرتی اور اقتصادی اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے اسلامی جمہوری نظام اور اسلامی نظام معیشت کا ایک عملی نقشہ پیش کرنے کی کوشش بھی کی۔

اشتراکیت اور مادیت کے اس خوفناک حملے سے متاثر ہو کر مغربی ممالک کے عیسائیوں نے کوشش کی کہ دنیائے اسلام کے مفکرین ان کے ساتھ مل کر اس لادینی نظام فکر کا مقابلہ کریں۔ جب ان کی طرف سے اس قسم کی پیش کش کی گئی تو مسلمانوں نے اسے قرآن مجید کی دعوت سمجھ کر فوراً دست تعاون بڑھایا۔ قرآن حکیم نے آں حضرت کو حکم دیا کہ آپ اہل کتاب کو دعوت دیجئے کہ ہم میں اور آپ میں جو چیز مشترک ہے یعنی خدائے واحد پر ایمان اس کی بنا پر ہم مل کر کام کریں۔ اور ان لوگوں کو جو اس سے منکر ہیں اس حقیقت مطلقہ کی طرف دعوت دیں۔

قل یا اھل الکتب تعالوا الی کلمۃ — آپ فرما دیجئے کہ اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے

سواءٍ بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ — اور تمہارے درمیان برابر ہے یہ کہ اللہ کے سوائے ہم کسی اور کی
ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً — عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے
اربابا من دون اللہ (۳ : ۶۴) — کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا رب نہ بنائے ۔

قرآن کی یہ دعوتِ اتحاد اور اشتراکِ عمل صدیوں تک عیسائی دنیا کے سامنے رہی لیکن کسی نے اس آواز پر لبیک نہ کہا ۔ جب اشتراکی لادینیت سیاسی طور پر مغربی ممالک کی سالمیت کے لیے ایک خطرہ بن گئی تو انہوں نے مسلمانوں کو اشتراکِ عمل کی دعوت دی ۔ چنانچہ ۱۹۵۴ء میں لبنان کے ایک شہر بحمدون میں ایک بین الاقوامی مجلسِ مذاکرہ کا پہلا جلسہ ہوا جس میں خلیفہ عبدالحکیم نے بھی شرکت کی ۔ انہوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں ایک ایسے مذہب سے وابستہ ہوں جس کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا کی ہر بڑی چھوٹی قوم کے پاس خدا کے پیغمبر خدا کا پیغام لے کر آتے رہے اور ان تمام پیغمبروں ، ان کی کتابوں اور ان کے مذاہب کی تصدیق اور توقیر میرے قلب و ذہن میں اس وقت جاگزیں تھی جب شاید میں اس قابل نہ تھا کہ دین کی صحیح حقیقت کو پا سکتا ۔ اس اجتماع میں انہوں نے ایک بہت اہم مسئلے پر تقریر کی : اسلام کس طرح نئی پود تک اپنے روحانی اور اخلاقی اقدار کو پہنچا سکتا ہے ؟ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی بنیاد اسی مقصد کے حصول کے لیے ڈالی گئی تھی ۔ خلیفہ مرحوم نے فرمایا کہ اس معاملہ میں اسلام دوسرے مذاہب کے مقابلے پر زیادہ خوش قسمت ہے ۔ اور اس میں اس کام کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے کہ وہ نئی نسل کے سامنے اپنے نظریۂ حیات کو بہترین شکل میں اور موجودہ حالات کے تقاضوں کے مطابق پیش کر سکے ۔ اگر ہم نے پوری کوشش کی تو بہت جلد مسلمان تہذیب و تمدن کے علمبردار بن سکتے ہیں اور باقی اقوام کے ساتھ امن ، انصاف ، اور دوستی کی بنیاد پر نئی زندگی کی شمع روشن کر سکتے ہیں ۔

اس کے ۲ سال بعد لبنان کے اسی شہر میں اس انجمن کا دوسرا اجلاس ہوا ۔ جہاں فیصلہ ہوا کہ اس انجمن کے نمائندے کے طور پر خلیفہ عبدالحکیم اور شیخ بہجت بیطار اضلاع متحدہ امریکہ اور کینیڈا کا دورہ کر کے وہاں کے لوگوں کے سامنے اسلامی دنیا کے نقطۂ نظر کی تشریح کریں اور اسلام کے نظریۂ امن و آشتی کا پیغام ان تک پہنچائیں ۔ یہ دورہ چھ ہفتے کا تھا اور اس دوران میں دونوں ملکوں کے دور دراز علاقوں تک ان دونوں نے اسلام کا پیغام پہنچایا ۔ اس کے قبل ۱۹۵۲ء میں مشہور نوبر سے ڈیم یونیورسٹی کی دعوت پر بھی وہ امریکہ گئے تھے ۔ جہاں ان کے ایک مشہور مذاکرے میں حصہ لیا تھا ۔ ان کا موضوع تھا ، اسلام میں تصورِ قانون جو بعد میں دوسرے اراکین کی تقریروں کے ساتھ ایک کتابی شکل میں شائع ہوا تھا ۔

ایک بین الاقوامی ادارہ "انسانی اخوت" (HUMAN BROTHERHOOD) کے نام سے قائم ہے

جس کا مقصد یہ ہے کہ تمام انسانوں کو ملک، مذہب، ملت، رنگ، زبان کے امتیازات سے بالاتر ہو کر ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے اور اس طرح خالص انسانی نقطۂ نظر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ درحقیقت یہ کوشش خالص اسلامی تھی۔ قرآنی نظریۂ حیات کے مطابق اسلام تمام بنی نوع انسان کی فلاح کا ذمہ دار ہے اور اس کا پیغام بلا امتیاز تمام انسانوں کے لیے ہے۔ یہی ایک دین ہے جس نے صحیح معنوں میں ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی جس میں نسل، زبان، رنگ کے امتیازات بالکل کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ موجودہ دور کا اسلامی معاشرہ اپنے دوسرے نقائص کے باوجود اس معاملہ میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم اس بین الاقوامی ادارہ کے سرگرم رکن تھے۔ ان کا دل ہر قسم کے تعصبات سے خالی تھا اور وہ دوسرے مذاہب اور ان کے پیروؤں کے متعلق انسانی نقطۂ نگاہ سے سوچتے تھے۔ ان پر تصوف کا رنگ بہت زیادہ نمایاں تھا اور شاید یہ تصوف ہی کا اثر تھا کہ دوسرے انسانوں سے ملتے وقت ہمیشہ وہ انسانی نقطۂ نگاہ سامنے رکھتے اور کبھی اختلاف مذہب وملت کو درمیان میں نہ لاتے تھے۔

حکومت پاکستان نے اسلامی قوانین کو جدید زمانے کی نئی معاشرتی ضروریات کے مطابق تشکیل دینے کے لیے زکوٰۃ کمیشن بٹھایا جس کے صدر خلیفہ عبدالحکیم تھے۔ اس کمیشن کا مقصد یہ تھا کہ زکوٰۃ کو اس طرح منظم کیا جائے کہ اس سے معاشرتی فلاح وبہبود کا کام لیا جا سکے۔ زکوٰۃ کے مصرف میں مثلاً ابن السبیل کی مدد بھی شامل ہے۔ جدید رجحان کے علماء نے یہ رائے دی کہ موجودہ زمانے میں سڑکوں کی توسیع ومرمت، ریلوے، تار و ڈاک خانہ، ہوائی جہاز اور بحری جہاز وغیرہ کے محکمے ابن السبیل کی مدد کے مترادف ہیں۔ کیا ان محکموں پر روپیہ خرچ کرنا زکوٰۃ کے مصرف میں شامل نہیں ہو سکتا؟ قدیم مکتب خیال کے علماء جو اس کمیشن کے ممبر تھے اسلام کے اقتصادی اصولوں کی اس جدید اور جائز توسیع سے متفق نہ ہو سکے اور اس طرح ایک عمدہ کام سرانجام نہ پا سکا۔ کچھ عرصے بعد حکومت نے عائلی کمیشن کی تشکیل کی اور خلیفہ عبدالحکیم اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ لیکن اس قدیم وجدید کی کش مکش کے باعث اس کمیشن کی سفارشات پر بھی عملدرآمد نہ ہو سکا۔

قدیم اور جدید مکاتیب فکر کی یہ کش مکش موجودہ دور کی اسلامی دنیا کے ایک اہم مسئلہ ہے اور ہر اسلامی ملک میں اس اختلاف نے بعض دفعہ افسوسناک صورت اختیار کر لی ہے۔ پاکستان میں کوشش کی جا رہی ہے کہ اس الجھن کو عمدگی اور خوش اسلوبی سے رفع کیا جائے۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ اسلامی نظریۂ حیات کو لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کیا جائے کہ جدید علوم وفنون اور صحت مند معاشرتی اور اقتصادی تقاضوں سے ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی تمام سرگرمیاں اسی مقصد کے حصول کے لیے تھیں۔

خلیفہ صاحب مرحوم کو فارسی اور اردو ادب سے بڑا شغف تھا۔ ان کو ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے اور اکثر خالص فلسفیانہ اور مذہبی مباحث کے دوران میں وہ اشعار کو بطور مثال اس طرح پیش کرتے کہ تمام مسئلہ واضح ہو جاتا۔ حافظ شیرازی

سے ان کی عقیدت بہت زیادہ تھی۔ وہ اکثر بڑے ذوق و شوق سے اپنی زندگی کے بے شمار واقعات سنایا کرتے جب انہوں نے اس لسان الغیب سے راہنمائی حاصل کی تھی اور اس سلسلے میں ان کے قصے ایک تاریخی حیثیت رکھتے تھے۔ زندگی کے مختلف دوروں میں کوئی اہم فیصلہ کرتے وقت یا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے وہ ضرور دیوانِ حافظ سے فال دیکھتے۔ جب کبھی کوئی معاملہ انہیں غیر معمولی طور پر پریشان کرے اور وہ کسی فیصلہ کن نتیجہ پر نہ پہنچ سکتے تو فوراً حافظ کی طرف رجوع کرتے اور ان کا کہنا تھا کہ جو قدم انہوں نے اس فال کی بنا پر اٹھایا وہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوا۔

غالب کی فارسی اور اردو شاعری سے بھی ان کا شغف بہت گہرا اور دیرینہ تھا۔ انہوں نے "افکارِ غالب" میں اس کے فلسفیانہ اشعار کی بہت عمدہ تشریح پیش کی جس کو ہر جگہ پسند کیا گیا۔ لیکن سب سے بڑھ کر انہیں اقبال اور رومی سے عشق تھا۔ اقبال کے متعلق ان کا سب سے پہلا مضمون "اقبال، نطشے اور رومی" تھا جس میں انہوں نے اقبال کے فکر کے مشرقی اور مغربی ماخذوں کا تنقیدی جائزہ لیا تھا۔ ان کی کتاب "فکرِ اقبال" اپنی معنوی خوبیوں کے لحاظ سے اقبالیات میں ایک بلند ترین مقام رکھتی ہے۔ اس میں انہوں نے اقبال کے فلسفہ کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی۔ ان کے بنیادی فلسفہ اور اس سے مستنبط اقتصادی، سیاسی، معاشرتی اور دینی نظریات کو بڑی فصاحت سے پیش کیا ہے۔ اس کے آخر میں علامہ اقبال کے انگریزی لیکچروں "تشکیلِ جدید" کے ہر باب کا ایک بہت عمدہ خلاصہ بھی پیش کیا ہے۔ علامہ اقبال کے زیرِ اثر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم رومی کے کلام اور فلسفہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ سب سے پہلے ۱۹۱۲ء میں انہوں نے رومی پر مقالہ لکھا۔ ۱۹۲۲ء میں ان کی انگریزی کتاب "رومی کی مابعد الطبیعیات" تیار ہوئی جو ۱۹۲۳ء میں چھپی۔ آج تک اس موضوع پر کوئی اور کتاب نہیں لکھی گئی۔ ۱۹۳۵ء میں حکمتِ رومی طبع ہوئی جس میں انہوں نے مولانا روم کے فلسفہ پر ایک نئے انداز میں سیر حاصل بحث کی۔ ان کی آخری کتاب "تشبیہاتِ رومی" اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک اچھوتی کوشش ہے۔ اس میں بسط و تفصیل سے انہوں نے بتایا کہ رومی سا نباضِ فطرت معمولی تشبیہوں سے کام لے کر فلسفہ حیات اور کائنات و انسان کے اسرار و غوامض کس آسانی سے حل کر دیتا ہے۔

لیکن خلیفہ عبدالحکیم کے صحیح علمی مقام کا اندازہ ان کی ان تصنیفات سے کہیں زیادہ ان کی گفتگو سے مل سکتا تھا جب وہ کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے تو ہر شخص ان کے طرزِ تکلم سے مسحور ہو جاتا۔ ان کے پاس لوگ ہر قسم کے مسائل لے کر آتے۔ ان میں سے بعض تو خدا تک کے منکر ہوتے تھے۔ لیکن خلیفہ صاحب کی زبان میں اتنی چاشنی ہوتی تھی اور ان کے علم و فکر کی گہرائی اتنی عمیق ہوتی تھی کہ ہر شخص مطمئن ہو کر جاتا تھا۔ وہ ہر شخص سے اس کے مبلغِ فکر کے مطابق بات کر سکتے تھے۔ وہ گھنٹوں باتیں کرتے رہتے لیکن کوئی شخص اکتاتا نہ تھا۔ کبھی دقیق مسائل پر گفتگو ہو رہی ہے، کبھی شعر و شاعری کا ذکر ہو رہا ہے۔ کبھی لطائف و ظرائف آموجود ہوتے۔ غرض وہ اپنی مجلسوں میں کئی رنگوں کا مرقع تھے۔

تصوف اور شاعری کے اس ذوق کے باعث وہ دل کے بہت نرم تھے۔ ہمدردی اور سخاوت میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ جہاں انہیں معلوم ہوا کہ کسی شخص کو ضرورت ہے فوراً اس کی حاجت سے بڑھ کر اس کی مدد کے لیے تیار ہو جاتے۔ اسلام اور آں حضرت سے ان کی شیفتگی عشق کی حد تک تھی۔ جب کبھی کسی عیسائی کی طرف سے کوئی اعتراض ہوتا تو وہ اس طرح مدافعت کے لیے تیار ہو جاتے کہ دیکھنے والے حیران ہو جاتے تھے۔ غرضیکہ وہ عجیب وغریب شخصیت کے مالک تھے اور دوست اور دشمن دونوں ان کی صلاحیتوں کے قائل تھے حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی

خلیفہ عبدالحکیم ایران میں

اقبال اور رومی میں دلچسپی لینے والے کم و بیش خلیفہ صاحب کے نام سے آشنا ہیں اور راقم کو بھی خلیفہ مرحوم سے دور کی آشنائی تھی۔ اپریل ۱۹۵۲ء میں خلیفہ صاحب یورپ سے آتے ہوئے تہران میں اترے۔ ان دنوں راجہ غضنفر علی خاں ایران میں پاکستان کے سفیر تھے اور خلیفہ صاحب کی غالباً ان سے دیرینہ ملاقات تھی۔ راجہ صاحب نے مجھے بلا کر کہا کہ پاکستان کے ایک بہت بڑے فیلسوف اور عالم تہران آئے ہیں اور چونکہ میرے ہاں ان کے لیے رہائش کی مناسب جگہ نہیں اس لیے میں انہیں اپنے پاس ٹھہرا لوں۔ معزز مہمان کے نام سے تو آشنائی تھی مگر ان کی عادات، طبیعت، اخلاق اور دیگر شخصی خصوصیات کے متعلق کسی قسم کا علم نہ تھا۔ میں خلیفہ صاحب کو اپنے ہاں لے آیا لیکن ان کی ظاہری شخصیت اور باطنی عظمت سے یقیناً مرعوب تھا اور مجھے اپنے اور اپنے وسائل پر پورا یقین تھا کہ میں ان کی خاطر خواہ خدمت اور دیکھ بھال کر سکوں گا۔ بہرحال خلیفہ صاحب میرے ہاں تشریف لے آئے اور یہ دن اپنی معنوی اہمیت اور اپنے دور رس ادبی اور ملی اثرات کے لحاظ سے میرے لیے ایک تاریخی دن تھا۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں مجھے خلیفہ صاحب سے صرف نہایت دور کی آشنائی تھی وہ بھی صرف ان کے نام تک محدود تھی۔ لیکن ابھی چند منٹ بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ میں یہ محسوس کرنے لگا کہ یہ تو میرے پرانے دوست اور رفیق ہیں۔ خلیفہ صاحب کا بشاش، خوش قیافہ چہرہ اور نہایت ہی بے تکلف طرز گفتار اور ان کا محبت آمیز خلوص "من و تو" کے تمام مراحل طے کر چکا تھا۔

پروگرام کے مطابق ان کا قیام یہاں غالباً صرف ایک دن تھا۔ اور اب میری انتہائی آرزو یہ تھی کہ ان کا قیام کچھ طویل ہو جائے مگر اس آرزو کے بر آنے کی بظاہر کوئی امید نہ تھی کیونکہ اگلے ہوائی جہاز میں ان کی سیٹ ریزرو ہو چکی تھی مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ موسم بہار کی بارش اور متغیر ہواؤں نے مزید تین دن خلیفہ صاحب کو تہران میں روکے رکھا۔ اس مختصر سے تین دنوں میں وہ کئی دلچسپ اور دل انداز یادگاریں یہاں چھوڑ گئے اور کچھ اپنے ہمراہ لے گئے۔ میں اس ضمن میں یہاں کی بعض شخصی ملاقاتوں کا ذکر ضروری خیال کرتا ہوں محض زیب داستاں کے لیے نہیں

بلکہ ان تاثرات اور اثرات کے پیش نظر جو بعد میں مختلف طور پر نتیجہ خیز ثابت ہوئے ۔

۲۱ ۔ اپریل کو سفارت خانہ پاکستان میں یوم اقبال کی تقریب تھی اور ایران کے علما ، فضلا اور ادبا بڑی تعداد میں جمع تھے ۔ جلسہ کے صدر علامہ علی اکبر دہ خدا مرحوم تھے وہ خدا ایران معاصر کی بلند ترین علمی اور ادبی شخصیتوں میں سے تھے اور ان کی بے مثل تالیف لغت نامہ (جو فارسی زبان میں دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتی ہے) شرق و غرب میں معروف ہے ۔ علامہ مرحوم نے اپنے صدارتی خطبہ میں اقبال کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ سیاسی غلامی سے ذہنی اور فکری غلامی خطرناک تر ہوتی ہے اور اقبال نے انسان کو ذہنی غلامی اور فکری فساد سے نجات دینے کی کوشش کی ہے ۔ اور یہ اقبال کا تمام اہل شرق پر احسان ہے ۔ خلیفہ صاحب پر ایران کے ہشتاد سالہ عالم اور نہضت مشروطہ کے مجاہد کے الفاظ کا بہت اثر ہوا ۔ اور مجھ سے کہا کہ میں علامہ دہ خدا سے خصوصی طور پر ملاقات کرنا چاہتا ہوں ۔ چنانچہ ان سے ملاقات ہوئی جس کا ذکر بعد میں آئے گا ۔

اسی جلسہ میں خلیفہ صاحب نے فی البدیہ اقبال پر فارسی زبان میں تقریر کی جس میں حاضرین کو بتایا کہ اقبال نے ملّا اور اس کی گمراہی پر نکتہ چینی کی ہے ۔ اس تقریر میں ، جو خلیفہ صاحب کی فارسی زبان میں پہلی تقریر تھی ، نہایت دلچسپ لطیفے اور داستانیں بیان کیں ۔ اگرچہ ان کا تلفظ اور لہجہ ایرانی نہیں تھا لیکن وہ الفاظ کو نہایت صاف صاف اور علیحدہ ادا کرتے تھے جس سے حاضرین کو سمجھنے میں کوئی مشکل نہ تھی ۔ سارا ہال قہقہوں سے گونج رہا تھا ۔ یہ تقریر یہاں پروگرام کے ساتھ ریڈیو تہران سے تمام ملک میں ریلے بھی کی گئی اور پڑھے لکھے لوگوں میں اس کا خاطر خواہ اثر ہوا کیونکہ ایران میں بھی کم و بیش وہی حالات موجود ہیں جن کی اقبال نے تنقید کی ہے ۔

جلسہ کے دوسرے روز میں علامہ دہ خدا کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ خلیفہ صاحب آپ کی خدمت میں ملاقات اور عرض ارادت کے لیے حاضر ہونا چاہتے ہیں ، علامہ کی صحت ایک مدت سے خراب تھی اور وہ بہت کم گھر سے نکلتے تھے ۔ بڑھاپے اور علالت کی وجہ سے ان کے لیے حرکت کرنا بھی مشکل تھا ۔ میری بات سن کر فرمایا کہ میں بیمار اور بوڑھا ہوں مگر ہماری قدیم ایرانی وضع داری اور مہمان نوازی کا تقاضا یہ ہے کہ میں خود ایسے بلند مقام دانشمند کی خدمت میں حاضر ہوں ۔ میں یہ گوارا نہیں کروں گا کہ وہ میرے پاس آئیں ۔ میں نے کہا کہ میرے لیے اور خلیفہ صاحب کے لیے آپ کا قدم رنجہ فرمانا باعث فخر ہے ۔ علامہ دہ خدا میرے ہاں تشریف لائے ۔ ان دو عظیم شخصیتوں کی ملاقات میری نظر میں ایک اہم تاریخی واقعہ تھا ۔ اتفاق سے ایران کے چند ایک اور ادیب اور شاعر بھی تشریف لے آئے تھے ۔ میں نے فوٹو گرافر کو ٹیلیفون کیا اور اس نے چند تصویریں لیں ۔ ان میں سے ایک گروپ کی تصویر میرے پاس تھی جو فارسی مجلہ ہلال میں چھپ چکی ہے ۔

خلیفہ صاحب سے ملاقات اور گفتگو کا علامہ دہ خدا پر بہت اچھا اثر ہوا۔ علامہ دہ خدا بھی مولانا روم کے مداحوں میں سے تھے اور خلیفہ صاحب کی باتیں نہایت توجہ سے سنتے رہے اور پاکستان میں ان کی دوستانہ دلچسپی میں اضافہ کی بڑی وجہ خلیفہ صاحب سے ملاقات تھی۔

مجھے اس سے پہلے معلوم نہ تھا کہ خلیفہ صاحب نے رومی اور اسلامی ادبیات کا اتنا وسیع اور اتنا گہرا مطالعہ کیا ہے اور فلسفۂ شرق و غرب پر ان کو اتنا عبور ہے۔ اس کے علاوہ انہیں بے شمار فارسی اشعار یاد تھے اور مناسب موقعہ پر ان اشعار کو پیش کرتے تھے۔ قیام کے تیسرے دن کی شام کو کچھ وقت مل گیا اور میں نے خلیفہ صاحب سے کہا کہ اگر ممکن ہو تو آپ کو پروفیسر بدیع الزمان فروزانفر سے مل لینا چاہیئے۔ پروفیسر فروزانفر ایران میں بلکہ دنیا بھر میں رومی کے سب سے بڑے محقق اور مفسر سمجھے جاتے ہیں اور میرا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ ملاقات ہمارے آیندہ ادبی اور علمی تعلقات کے لیے مفید ثابت ہوگی۔ میں نے فروزانفر صاحب کو ٹیلیفون کیا کہ ہم چند منٹ کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ ضمناً میں نے ان کو کہہ دیا کہ خلیفہ صاحب برصغیر میں سب سے بڑے رومی کے محقق ہیں اور سب سے پہلے رومی کے فلسفہ پر جو کتاب لکھی گئی ہے انہی کے قلم سے ہے۔ ٹیلیفون محض اطلاع کے لیے کیا تھا خلیفہ صاحب کو لے کر غروب کے کچھ بعد ہم پروفیسر فروزانفر کی خدمت میں پہنچ گئے۔ ان دو عظیم المرتبت شخصیتوں کی گفتگو میرے لیے سرور روح تھی۔ چند منٹ کی مختصر ملاقات میں ان دو عالموں اور ان کے وسیلے سے دو ہمسایہ ملکوں کے ادبی اور علمی حلقوں کے درمیان ایک گہرا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔

خلیفہ صاحب کے قیام تہران کے دوران کا ایک اور دلچسپ اور نتیجہ خیز واقعہ ان کی لیڈی ڈاکٹر نگینہ کاظمی سے ملاقات ہے۔ مارچ ۱۹۵۲ء میں بیگم لیاقت علی خاں کی طرف سے کئی ممالک کی خواتین کو اپوا (A PWA) کے بین الملی جلسہ میں شرکت کے لیے دعوت دی گئی۔ ایران کی طرف سے بھی کافی تعداد میں خواتین نے شرکت کا ارادہ اور وعدہ کیا۔ مگر عین وقت پر معلوم ہوا کہ مختلف وجوہات کے باعث سب نے پاکستان جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ ہم سفارت کی طرف سے کئی ایک نام بھجوا چکے تھے اور اس پہلے مہم بین الملی جلسہ میں ایران کی طرف سے اب ایک خاتون بھی جانے کو تیار نہ تھی۔ جب صرف ایک دن باقی رہ گیا تو سفیر کبیر کے ایما سے میں ڈاکٹر کاظمی کے ہاں گیا اور کہا کہ ایران کی غیبت ہم سب کے لیے افسوس ناک ہوگی۔ دو ہمسایہ ملکوں کے درمیان اتنے تعلقات ہوتے ہوئے کم از کم ایک خاتون کو جلسہ میں شرکت کرنی چاہیئے۔ یہاں اس بات کا ذکر کر دینا لازم ہے کہ اس زمانے میں ہمارے ایران سے تعلقات تو دوستانہ تھے مگر حالات موجودہ حالات سے بہت مختلف تھے۔ ایران کی دوستی حاصل کرنے کے لیے کئی ممالک میں رقابت تھی اور اغلب دعوتیں جو ایرانیوں کو بیرونی ممالک سے آتی تھیں

ان کا تمام خرچ دعوت دینے والے ملک کے ذمہ ہوتا تھا مگر اپوا کے جلسہ میں ایران سے لاہور کا خرچ شرکت کرنے والی خاتون کے ذمہ تھا یا اس مدعو ملک کی حکومت کو ادا کرنا تھا۔ حکومت کا جہاں تک تعلق ہے اسے اس جلسہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بہرحال کچھ گفتگو اور بحث تمحیص کے بعد میں نے ڈاکٹر کاظمی کو شرکت اور ان کے والد محترم پروفیسر کاظمی کو اجازت دینے پر آمادہ کر لیا۔ دوڑ دھوپ کے بعد ہمارے ہم کار ملک محمد اکرام نے اپنی بیگم کو جو لاہور میں موجود تھیں بذریعہ تار اس محترم خاتون کی آمد کی اطلاع دے دی تاکہ وہ مناسب طور پر ان کا استقبال اور رہائش وغیرہ کا انتظام کر سکیں۔ لاہور میں قیام کے دوران میں ایرانی مہمان کا وہاں کے علمی و ادبی حلقوں اور پنجاب یونیورسٹی کے اساتذہ اور دیگر فارسی دوست لوگوں سے تعارف کرایا گیا جس کا بہت اچھا اثر ہوا چنانچہ ڈاکٹر نگینہ کاظمی جب تہران واپس آئیں تو ہر لحاظ سے پاکستان اور خاص کر خواتین پاکستان کی گرویدہ تھیں۔ ڈاکٹر کاظمی نے خود بخود 'انجمن بانوان ایران' میں ایک جلسہ کا انتظام کیا اور سفارت کے اراکین کو شرکت کی دعوت دی۔ ہمارے لیے ان ابتدائی مراحل میں یہ ایک غیر متوقع موقع تھا اور میں نے خلیفہ صاحب سے کہا کہ مناسب ہوگا اگر وہ بھی اس جلسہ میں شرکت کریں خلیفہ صاحب نے نہایت خوشی اور اشتیاق سے دعوت قبول کی اور کہا کہ ایسے موقعوں پر پاکستانیوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں شرکت کرنی چاہیے

سفارت کے ایک اور آفیسر افضل اقبال (جن کو ایرانی ادبیات میں غیر معمولی دلچسپی ہے) بھی ہمارے ہمراہ اس جلسہ میں شریک ہوئے۔ ہم جلسہ میں بہت دیر سے پہنچے اور جب ہال میں داخل ہوئے تو کافی انتظار کرنے کے بعد ڈاکٹر کاظمی تقریر شروع کر چکی تھیں اور ہال میں کوئی پاکستانی موجود نہ تھا ہمارے آنے کے بعد ڈاکٹر نے مختصر طور پر اپنی تقریر کو دہرایا اور تقریباً ایک گھنٹہ تک پاکستانیوں کے خلوص، ان کی ایران دوستی اور فارسی زبان میں دلچسپی کے متعلق تقریر کی۔ یہ پہلی تقریر تھی جو عورتوں کے جلسہ میں پاکستان کے بارے میں کی گئی اور حاضرین نے نہایت دلچسپی سے اس تقریر کو سنا خلیفہ صاحب پر مقرر خاتون کی سادگی بیان اور پاکستان سے ان کی گہری ہمدردانہ دلچسپی کا بہت اثر ہوا اور انہوں نے ڈاکٹر کاظمی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کی پرخلوص تقریر کی تعریف کی اور کہا کہ آپ کی تقریر ایرانی خواتین میں پاکستان کے متعلق دلچسپی پیدا کرنے میں بہت موثر ثابت ہوئی ہے اور میں آپ کے خلوص اور ہمدردی سے اتنا متاثر ہوا ہوں کہ میرے دل میں ایران کی اور بالخصوص ہر ایرانی خاتون کی عزت بڑھ گئی ہے۔ خلیفہ صاحب تو واپس پاکستان چلے گئے لیکن ڈاکٹر کاظمی سے ان کی ملاقات اور باتوں کا یہ اثر ہوا کہ وہ پاکستان کی نہایت مخلص دوست بن گئیں اور ۱۹۵۲ء میں جب انجمن فرہنگی ایران و پاکستان کی طرف حکومت کی کوئی توجہ نہ تھی، ڈاکٹر کاظمی نے اس انجمن کا انتظام اور خرچ اپنے ذمہ لے لیا اور تقریباً تین سال بہت مفید خدمت انجام دیتی رہیں۔ خلیفہ صاحب پر اس

نیک دل خاتون کی بے لوث خدمت کا جو اس نے کئی سال شخصی اور نجی حیثیت سے اور حکومت ایران یا پاکستان کی طرف سے کسی قسم کی ہمت افزائی یا تشویق کے بغیر انجام دیں گہرا اثر تھا اور انہوں نے ڈاکٹر کاظمی کو فروری ۱۹۵۶ء میں پاکستان آنے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر کاظمی نے دس روز مغربی پاکستان کا دورہ کیا۔ لاہور میں انہوں نے خلیفہ صاحب کے ہاں ہی قیام کیا اور نہایت اچھے تاثرات لے کر واپس ہوئیں۔

دسمبر ۱۹۵۶ء میں لاہور یونیورسٹی کے زیر اہتمام بین الملی اسلامی مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی جس میں ایران کے چند علمانے جن میں ڈاکٹر رضازادہ شفق، پروفیسر سعید نفیسی اور پروفیسر فروزانفر بھی شامل تھے شریک ہوئے۔ مذہبی معاملات میں خلیفہ صاحب کی بلند اور وسیع نظر اور مشرق و مغرب کے فکری اور ادبی علوم سے گہری آشنائی سے یہ سب علما متاثر ہوئے۔ ڈاکٹر شفق سے خلیفہ صاحب کی ملاقات یورپ، امریکہ اور دیگر بین الملی مجالس میں بھی ہوئی اور ڈاکٹر شفق ان کے شخصی اخلاق اور وسعت مطالعہ کے بڑے مداح ہو گئے۔

جب خلیفہ صاحب کی ناگہانی موت کی خبر ایران پہنچی تو ان کے صدہا جاننے والوں کو بہت رنج ہوا۔ انجمن فرہنگی ایران۔ پاکستان کی طرف سے پاکستان کے اس عالی قدر عالم اور ادیب کی یاد میں ایک جلسہ ہوا جس میں تہران کے علما و فضلا و شعرا نے شرکت کی۔ ایران کے بلند پایہ شاعر آقائے صادق سرمد نے اس جلسہ کی صدارت فرمائی۔

جلسہ کے صدر آقائے سرمد نے اس انداز سے سلسلۂ کلام کا آغاز کیا:

انساں بہر مقام و بہر شاں و رتبتے است
ہر خوان زندگانیش از مرگ قسمتے است

حکم ممات بر سر بازیچۂ حیات
حکم طبیعت است و بحکم مشیتے است

کس را مجال نیست کہ بگریزد از اجل
گر عادل است آں حتمی قضیتے است

(انسان کسی مقام، کسی شان اور کسی رتبے کا حامل ہو، جب زندگی کا خوان اس کے لیے آراستہ کیا جاتا ہے تو لا محالہ اسے موت کا ذائقہ ضرور چکھنا پڑتا ہے —— بشری تقاضا یہی ہے کہ موت اس لہو و لعب کی زندگی کا سلسلہ منقطع کر دے، مشیت ایزدی بھی یہی ہے —— موت سے گریز و فرار کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ خواہ جلد آئے یا بدیر موت قدرت کا ایک اٹل قانون ہے)

آج کی رات پاکستان کے عالی مقام مفکر اور ممتاز و متبحر شخصیت خلیفہ عبدالحکیم کی روح پرفتوح کی مبارک پرواز کے اعزاز میں انجمن نے یہ جلسہ منعقد کیا ہے جس میں شرفا و خواتین رونق افروز ہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نے اسلامی فضائل و کمالات کے مکتب میں تربیت پائی تھی اور جب تک آپ اس دنیا میں رہے علم و فضل کے موتی بکھیرتے اور لٹاتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جب کہ آپ اس دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں، آپ کے علم و فضل کی

آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، دنیائے فضل و کمال کی نظر آپ پر اور آپ کی نظر دنیائے فضل و کمال پر ہے۔
اگرچہ اس نوع کی شخصیتوں کی ابدی زندگی کا آغاز موت سے ہوتا ہے لیکن جہاں تک ان کے مادی آثار اور عالم انسانی کی حرماں نصیبی کا تعلق ہے، ملت کے کسی ممتاز فرد کی رحلت کا احساس دل و دماغ پر گہرے اثرات چھوڑ جاتا ہے:

آرے کسیکہ خدمت امت مرام اوست — مرگش نہ مرگ یک تن و بل مرگ امتے است

(جس کی زندگی کا نصب العین قوم کی خدمت رہا ہے اس کی موت کسی ایک فرد کی موت نہیں بلکہ پوری قوم کی موت ہے)

خلیفہ عبدالحکیم نے خدمت اسلام اور ایران و پاکستان کے ثقافتی روابط کی توسیع کے سلسلے میں پوری عمر بسر کی ہے لہذا موصوف کی رحلت سے ہمارے ثقافتی روابط اور عالم اسلام میں رخنہ پڑ گیا ہے میں ایران و پاکستان میں دو بار موصوف کی زیارت سے مشرف ہوا ہوں آپ کا شمار ان حکمائے اسلام میں ہوتا ہے جن کی اسلام کے حقائق و معارف پر گہری نظر تھی اور آپ پر یہ حقیقت بخوبی روشن تھی کہ اسلام وہ دین ہے جس کی اعلیٰ تعلیمات درس حیات دیتی ہیں۔ رشد و ہدایت کا سرچشمہ اور انسان کی صلاح و فلاح کا وسیلہ بھی یہی تعلیمات ہیں اور ان کے کمال میں کوئی کلام نہیں۔

مرحوم خلیفہ عبدالحکیم کی یہ کوشش رہی ہے کہ اپنے ادارہ تصنیف و تالیف (ادارہ ثقافت اسلامیہ) کی سرپرستی میں ایسی جدید تالیفات منظر عام پر لائیں جو ملت اسلامیہ کی عزت و ناموس کے دامن پر دشمنان اسلام کے توہمات کی گرد نہ جمنے دیں اور اسلام کے احکام و قوانین ٹھیک اسی انداز اور اسی نہج پر دنیا کے سامنے پیش کریں جو عہد نبوت میں خود رسول کریمؐ کا معمول رہا ہے۔ یقیناً ایسی عظیم الشان شخصیت کی رحلت باعث صد افسوس و ملال ہے۔

لاجرم در مرگ اہل معرفت — گفت باید "اے دریغا عالمے"

کسی حق شناس کی موت پر بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم یہ کہیں "آہ! عالم کی موت عالم کی موت ہے۔"

صدر جلسہ کی تقریر کے بعد ایران کے مشہور مفکر استاد ڈاکٹر شفق نے جو بین الملی کانفرنسوں میں مرحوم خلیفہ صاحب کے رفیق رہے ہیں تقریر کی اور خلیفہ صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ چار سال سے زیادہ عرصہ گزرا کہ بیروت میں اسلامی و مسیحی انجمن کا اجلاس منعقد ہوا تھا اس اجلاس کے شرکاء میں سے میں نے ایک بزرگ شخصیت کے نام و مقام کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا جب مجھے اس کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ شخصیت فضل و دانش کا پیکر اور تبحر علمی کا حامل ہے۔ میں نے چاہا کہ زبان حال سے یہ کہوں:

می شنیدم کہ جان جانانی — بینم اکنوں ہزار چندانی

(ترجمہ: میں سنا کرتا تھا کہ تو جان جاناں ہے لیکن اب جو میں تجھے دیکھتا ہوں تو ہزار گنا زیادہ پاتا ہوں) موصوف کی طلاقت لسانی اور وسعت علم و آگاہی نے اس مختصر سی مدت میں نہ صرف مجھے بلکہ ایک جماعت کو پاکستان کے اس نامور مفکر خلیفہ عبدالحکیم کی عظیم الشان شخصیت کا قائل کر دیا تھا۔ رنج و ملال کی انتہا ہے کہ آج موصوف کی وفات حسرت آیات کی خبر وحشت اثر نے ان کے تمام مخلص دوستوں کو غم واندوہ سے دوچار کر دیا ہے۔

حقیقت میں خلیفہ عبدالحکیم حکیم تھے اور ہمیشہ ان کے آثار و افکار سے حکمت کی روح ٹپکتی تھی۔ مرحوم کی نمایاں خصوصیت بردباری تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ موصوف کو دیگر اقوام کے افکار و خیالات سے بھی اچھی خاصی واقفیت تھی۔ آپ پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہو چکی تھی کہ حقیقت ایک ہے البتہ ظاہر میں اس کی شکلیں اور ہیئتیں مختلف ہیں۔ اختلافات و تنازعات جو مختلف اقوام و ملل میں پائے جاتے ہیں فروع میں ہیں اصول میں نہیں۔ مسجد ہو یا بت خانہ ہر مقام جلوہ گاہ کبریا اور مرکز عشق ہے۔ موصوف کی یہی بلند خصلت تھی جس نے انہیں تمام اقوام کے ساتھ رواداری اور ملاطفت پر آمادہ کیا تھا۔ آپ ان کے عقائد اور ان کی تعلیمات کے بارے میں نہایت فراخ حوصلگی کے ساتھ ذوق سماعت کا ثبوت دیتے۔ ہر شے پر اس کی تہ میں ڈوب کر نظر ڈالتے۔ موصوف کی نظر ظاہر سے زیادہ باطن، پوست سے زیادہ مغز اور ریت سے زیادہ دانے پر ہوتی تھی۔ آپ کی چشم امتیاز سے کوئی شے چھپی ہوئی نہ تھی۔

اگر کوئی اس واجب الاحترام مفکر کی تصنیف لطیف 'عقیدۂ اسلامی' کا جس میں عقائد اسلام کے اصول کے ضمن میں اہم مباحث آئے ہیں، امعان نظر سے مطالعہ کرے تو اس پر موصوف کے فضل و کمال اور علم و دانش کی حقیقت بخوبی واضح ہو جائے گی اور اسے یہ اندازہ ہوگا کہ ان کے انتقال سے علوم و معارف کی دنیا کتنے عظیم نقصان سے دوچار ہوئی ہے۔ موصوف کی ایک دوسری گرانقدر تالیف جس سے ژرف نگاہی اور تنویر فکر کی شہادت ملتی ہے بلاشک و شبہ وہ ہے جو آپ نے 'اسلام اور کمیونزم' کے موضوع پر سپرد قلم کی ہے۔ اس تالیف میں موصوف نے ہر دو دینی و دنیاوی مکاتب فکر کی علمی حقیقت بے نقاب کی ہے باریک نکات بڑی خوبی سے بیان کیے ہیں اور ان مسائل کی گرہیں جو بہت کچھ الجھے ہوئے تھے کھول کر رکھ دی ہیں۔

اختصار بیان کے باوجود میں مرحوم کے اس علاقے کے بارے میں کچھ کہے بغیر نہیں رہ سکتا جو آپ کو ایران اور ایرانی فلسفہ و ادب سے تھا۔ نہ صرف یہ کہ موصوف نے اردو زبان میں مولانا جلال الدین رومی پر ایک کتاب تحریر کی ہے یا دوسری تحریریں اس سلسلے میں سپرد قلم کی ہیں بلکہ آپ ہمیشہ ہماری ملت اور ہمارے ملک کے بارے میں مہر و مروت اور لطف و کرم سے اظہار خیال فرماتے تھے گفتار و رفتار سے اس تعلق خاطر کی غمازی ہوتی تھی۔

اکثر و بیشتر یہ مفکرِ پاکستان، ایران و پاکستان کی ملتوں کو معناً ایک ہی ملت قرار دیتے تھے اور ہمیشہ یک جہتی، ہم آہنگی اور یگانگی موصوف کا موضوعِ سخن رہتا تھا۔

افسوس، صد افسوس!! یہ گنجینۂ علم و معرفت بے سرو سامانی کے عالم میں ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا سچ تو یہ ہے کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ میں برادران پاکستان کو پیغامِ تعزیت دوں یا خود کشور ایران کے باشندوں کو۔ نہ صرف ایران و پاکستان کی ملتیں بلکہ تمام ملتیں خلیفہ عبدالحکیم کے حادثۂ ارتحال سے غم زدہ و اندوہگیں ہیں۔

خدایا! مرحوم کو بہشت جاودان میں جگہ دے۔ مرحوم کے گرامی قدر خاندان اور احباب و تلامذہ کو اس مصیبت عظمیٰ میں صبر و تحمل کی توفیق عطا کر۔

اس کے بعد راقم الحروف نے مرحوم خلیفہ صاحب کی زندگی، عظمتِ فکر اور علمی آثار پر شرح و بسط کیساتھ اظہارِ خیال کیا نیز مرحوم کے سفرِ ایران سے متعلق جو قابلِ ذکر حالات تھے ان پر بھی روشنی ڈالی پھر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی گرانقدر تالیف "حکمتِ رومی" سے چند اقتباسات کا فارسی میں ترجمہ کیا تاکہ حاضرین اس سے استفادہ کرسکیں حاضرین نے یہ ترجمہ پوری توجہ کے ساتھ سنا۔ آخر میں میں نے خلیفہ صاحب مرحوم کے متعلق اپنے احساسات ایک نظم کی شکل میں پیش کیے جو درج ذیل ہے:

ای حکیم اے مایۂ دانش وران — ایکہ بودی افتخار دوستان
ای دریغ آں گرمی گفتار تو — ای دریغ آن کلک گوہربار تو
از دم تو امتزاج دل نشین — یافت فکر شرق با مغرب زمین
حرف تو از عشق و از بازار عشق — فکر تو دانندہ اسرار عشق
بہر تبلیغ محبت ہر زمان — گاہ جنت شرقیان گہ غربیان
تو بہر جمعیتی نالاں شدی — بہر انسان چشم تو گریاں بدی
قال تو ما را زبان حال بود — یادگار رومی و اقبال بود
اے حکیم اے ہم نشین اولیا — مرگ تو گامیست در راہ بقا
اے حیات عاشقان بعد مردگی — دل نیابی جز کہ در دل بردگی

پروفیسر ہارون خاں شروانی

خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کا حیدرآباد دکن میں قیام

جامعہ عثمانیہ کے قیام سے پہلے میں خلیفہ عبدالحکیم مرحوم سے واقف نہ تھا۔ ۱۹۱۹ء میں جامعہ عثمانیہ قائم ہوا اور میرا تقرر "مددگار" پروفیسر تاریخ کی حیثیت سے کیا گیا۔ مجھے ۲۲ر اگست کو حیدرآباد پہنچنا تھا۔ اس سے چار چھ دن پہلے علیگڈھ میں عبدالمجید خواجہ صاحب کی کوٹھی حبیب باغ میں (جو اب مسلم یونیورسٹی طلبہ کالج کا اقامت خانہ ہے) خواجہ صاحب کے ساتھ چائے پی رہا تھا کہ ڈاکٹر عطار اللہ بٹ جو ان دنوں کالج کے میڈیکل افسر تھے آئے اور وہ بھی ہمارے ساتھ چائے میں شریک ہو گئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ حیدرآباد کب جا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں ۰۰ر کو جا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ بہت اچھا ہوا، میرے نسبتی بھائی خلیفہ عبدالحکیم بھی اسی ذیل سے جا رہے ہیں آپ کا ان کا ساتھ ہو جائے گا۔ وہ جامعہ عثمانیہ میں فلسفے کے "مددگار" پروفیسر مقرر ہوئے ہیں۔ وہ آپ سے دہلی میں ملیں گے۔

خلیفہ صاحب سے میری پہلی ملاقات دہلی کے اسٹیشن پر ہوئی۔ ہم دونوں ایک ساتھ حیدرآباد پہنچے۔ ایک ساتھ اپنے اپنے کام کا "جائزہ" لیا۔ کئی سال ایک ہی جگہ رہے۔ ایک ہی ہفتے میں دونوں کی شادیاں ہوئیں۔ جامعہ عثمانیہ کے طلبہ نے ایک ہی تاریخ میں دونوں کو مبارکبادی عصرانہ دیا، اور پرلطف بات یہ ہے کہ خلیفہ نے اس عصرانے میں میرا بنارسی شملہ زیب سر کیا۔ چنانچہ اس عصرانے میں ہم دونوں کی جو تصویر لی گئی وہ اس وقت تک میرے کمرے میں بھولے بسرے زمانے کی یاد تازہ کر رہی ہے۔ ہم دونوں کی تنخواہیں زیادہ نہ تھیں اس لیے ہم نے وحیدالرحمٰن "مددگار" پروفیسر طبیعیات کے ساجھے میں ایک وسیع بنگلہ کرائے پر لے لیا۔ ہم دونوں مجرد تھے اور وحیدالرحمٰن متاہل، مگر ان کی بیگم حیدرآباد نہیں آئی تھیں۔ مکان وسیع تھا۔ ہم میں سے ہر ایک کو دو دو کمرے اور ایک ایک غسل خانہ ملا۔ اس کے علاوہ کھانے اور بیٹھنے کے کمرے مشترک تھے۔ مکان کے عقب میں ایک بڑا خانہ باغ تھا جس میں مختلف قسم کے پھلدار درخت تھے۔ میرے متعلق جو کمرے تھے وہ اس باغ کے بالکل محاذ میں تھے، اور میری کھڑکیوں سے پورا باغ نظر آتا تھا۔ خلیفہ سے اپنے کمروں میں صبر نہ ہو سکتا تھا۔ وہ جامعہ کے اوقات سے علاوہ اپنا بیشتر وقت باغ میں بسر کرتے

تھے۔ ہمیشہ ہاتھ میں کوئی کتاب ہوتی یا پنسل کاغذ۔ پنسل کاغذ اس لیے کہ کسی شعر یا نظم کے لیے طبیعت موزوں ہو تو کمرے سے لانا نہ پڑے۔ میں نصاب کی کتابوں کا ذرا زیادہ مطالعہ کرتا تو مجھے کمرے سے کھینچ لے جاتے اور کہتے بھائی ابھی تو صرف انٹرمیڈیٹ کی کلاسیں ہیں! اگر اس وقت مطالعے کا یہ عالم ہے تو جب بی۔ اے۔ ایم۔ اے کو پڑھانا پڑے گا تو تم اپنے آپ کو بالکل ہلاک ہی کر ڈالو گے۔

میری اور خلیفہ کی عمر میں کم وبیش ایک سال کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ وحیدالرحمٰن عمر میں ہم دونوں سے ذرا بڑے ہوں گے۔ خلیفہ کی طبیعت میں جولانی بھری ہوئی تھی تو وحیدالرحمٰن نسبتاً سنجیدہ تھے۔ بہت سے نوجوان فلسفی شعرا کی طرح خلیفہ کے مزاج میں بھی ذرا لاابالی پن تھا مگر کپڑے وہ نہایت نفیس پہنتے تھے۔ تازہ ولایت قسم کے لوگوں کی طرح پتلون کی شکن، ٹائی، کالر کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ مگر دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے ان کا دوپہر کا قیلولہ ناغہ نہ ہوتا تھا۔ ہمارے "گھرانے" میں جتنا فرنیچر تھا وہ سب کا سب کرائے کا تھا۔ پلنگ، کرسی، میز، برتنوں کی الماریاں، کتابوں کی الماریاں، یہاں تک کہ غسل خانوں کا پورا سامان کرائے کا تھا۔ صرف کھانے کے برتن، چھری کانٹے، چمچے میرے تھے۔ کرائے کے فرنیچر کا انتخاب وحیدالرحمٰن نے کیا تھا جن کا مزاج ذرا نوابانہ تھا۔ چنانچہ ہم میں سے ہر ایک کو فرنیچر کے کرائے کے چالیس پینتالیس روپے ماہوار دینے پڑتے تھے۔ ایک روز خلیفہ نے کہا کہ بھائی ہم اس نوابانہ ٹھاٹھ سے باز آئے، ہمیں اپنی چیزیں خرید لینی چاہئیں۔ حیدرآباد میں ایک اہم ادارہ حراج خانوں کا تھا۔ بیسیوں حراج خانے تھے اور ان میں سوئی سے لیکر موٹریں اور ہاتھیوں تک نیلام ہوتی تھیں۔ خلیفہ نے کہا کہ میں حراج خانے جا کر فرنیچر ہی نہیں بلکہ برتن بھی خرید لاتا ہوں۔ برتن میرے پاس تھے میں نے کہا برتن خریدنے کی کیا ضرورت ہے؟ جواب دیا کہ کل تمہاری بیگم آجائے گی تو برتن تو وہ لے جائیں گی، پھر ہم کیا ٹھیکروں میں کھائیں گے؟ غرض وحیدالرحمٰن اور میں نے خرید اشیاء کا کام خلیفہ کے سپرد کیا۔ حراج عموماً چھٹی کے دن جمعہ کو ہوا کرتے تھے خلیفہ صاحب ناشتے کے بعد چل دیئے اور دس گیارہ بجے سے سامان آنا شروع ہو گیا۔ ان میل بے جوڑ کباڑیا ڈرائنگ روم کے لیے تین طرح کی کرسیاں اور صوفہ، کھانے کے کمرے کے لیے ایک اعلیٰ درجہ کا کرسی سیٹ ٹین کے چمچے چمچیاں؛ ایک بہت بڑا سنگ مرمر کا شیر، اندر والے برآمدے کے لیے (جس کا نام ہم نے ٹیپو سلطان کے مہمان خانے کے نام پر" دریائے دولت" رکھ چھوڑا تھا) نہایت خوبصورت مگر نہایت بے آرام کرسیاں، نہ جانے کتنے فریم جن میں طرح طرح کی تصویریں، زیادہ تر مناظر اور خوش رو اور بدصورت دونوں وضع کی لڑکیوں کی تصویریں اور خدا جانے کیا کیا متفرق چیزیں جو آنی شروع ہوئیں تو برابر مغرب کے

وقت تک آتی رہیں۔ مغرب سے ذرا پہلے خلیفہ مسکراتے ہوئے آئے۔ ہم نے کہا کہ بھائی یہ کیا خاک بلا اٹھا لائے ہو۔ ایک طرف تو سنگِ مرمر کا شیر اور دوسری جانب یہ ٹین کے کچھے کس غرض سے خرید سے گئے ہیں؟ خلیفہ نے نیم سنجیدہ اور نیم مزاحی انداز میں کہا کہ جی کچھے میں نے دیکھے تھوڑا ہی تھے۔ حراج گر نے تعریف کی، میں نے بولی بول دی۔ میں نے سمجھا کہ الکٹرو پلیٹڈ ہوں گے۔ خیر اب ہم اگلے حراج میں انہیں بھیج دیں گے!

ہم تینوں کا ساتھ چند مہینوں بعد چھوٹ گیا۔ وحید الرحمٰن وظیفہ لے کر یورپ چلے گئے۔ خوش قسمتی سے اردو کے مشہور ادیب مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی (ولد مولوی ذکاء اللہ صاحب) دار الترجمہ کے ناظم بن کر حیدر آباد آ گئے اور ہم دونوں نے ایک بنگلہ کلیہ جامعۂ عثمانیہ کے قریب لے لیا۔ خلیفہ صاحب بھی ہمارے ساتھ رہنے لگے۔ یہ زمانہ خلیفہ کی شاعری کے اوج کا زمانہ سمجھنا چاہیئے۔ شام کے وقت ہمارے بنگلے میں کلب کی سی فضا پیدا ہو جاتی تھی۔ جامعہ کے اساتذہ، دار الترجمہ کے مترجم اور بعض دوسرے علم دوست اصحاب جمع ہوتے تھے اور خلیفہ کی بذلہ سنجی، مزاح آفرینی، حاضر جوابی، اور شاعری سے فضا گونج جاتی تھی۔ کبھی کبھی رات کے دو ڈھائی بجے خلیفہ کے کمرے سے گنگنانے کی آواز آتی تھی۔ اسی وقت اشعار موزوں ہو جاتے اور دوسرے دن مغرب کے بعد سنائے جاتے۔ رفتہ رفتہ خلیفہ کی مانگ حیدر آباد کی محفلوں میں ہونے لگی۔ بیاض کافی ضخیم تھی اور اکثر کار ہی میں رکھی رہتی تھی۔ اور وقت پر منگا لی جاتی تھی۔ اس بیاض میں قومی، مزاحی، تعلیمی، شخصی غرض ہر طرح کی نظمیں ہوتی تھیں۔ اور موقع کی مناسبت سے پڑھ دی جاتی تھیں۔ بعض نظموں میں مزاح کے پردے میں بڑی کام کی باتیں ہوتی تھیں۔ جب گاندھی جی نے ہندوستان کی نجات کو چرخے کے ساتھ وابستہ کیا اور چرخہ کانگریس کے ترنگے میں چسپاں کیا گیا تو خلیفہ صاحب نے اپنی نظم

"چل میرے چرخے چرخ چوں"

موزوں کی جو قوم پرست اور انگریز پرست دونوں طرح کی محفلوں میں مقبول ہوئی۔ افسوس ہے کہ یہ نظم راقم الحروف کے پاس نہیں ہے ورنہ اس سے اس کا اندازہ ہو جاتا کہ خلیفہ مزاح کے پیرائے میں بھی کتنی گہرائیوں تک پہنچ جاتے۔

تقریباً ایک سال کے بعد یہ ثالوث مقدس بھی ٹوٹ گیا۔ میں کلیہ جامعہ عثمانیہ کے اقامت خانے کا مؤدب مقیم (وارڈن) مقرر ہوا اور مجھے اقامت خانے ہی میں رہنا پڑا۔ مگر یہاں بھی خلیفہ کا اور میرا ساتھ نہیں چھوٹا اس لیے کہ وہ میرے ساتھ مؤدب غیر مقیم مقرر ہوئے اور اس بہانے سے ہفتے میں کم سے کم دو روز (جب وہ اپنی مؤدبی کے فرائض پورے کرنے کے لیے اقامت خانے آتے) ان سے لطفِ ملاقات رہتا۔

اسی دوران میں ہم دونوں کی شادیاں ہوگئیں اور میں نے مؤدبی کو خیر باد کہا۔ خلیفہ صاحب نے بھی عنایت اللہ صاحب کا ساتھ چھوڑ دیا اور ایک الگ بنگلہ کرائے پر لے لیا۔ مگر انہیں کہیں نہ کہیں تو اپنی تقریر اور اپنے علم مجلس کے جوہر دکھانے تھے۔ اب ان کی آماجگاہ اساتذہ کا کامن روم بن گیا۔ شعبۂ دینیات کے منطق کے استاد مولوی سید ابراہیم صاحب اور خلیفہ میں خوب خوب چوٹیں رہتی تھیں۔ مولوی صاحب کی منطق وہی جامعہ نظامیہ والی منطق تھی جس پر انہیں لاثانی عبور حاصل تھا۔ حدیث، منطق، فلسفہ، کلام سب کی درسی کتابوں کے صفحے کے صفحے حفظ یاد تھے۔ ان کے استدلال کے طریقے خلیفہ کے استدلال کے طریقوں سے بالکل جدا تھے۔ اور بحث ہوتی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ دونوں گویا میز کے چاروں طرف گھوم رہے ہیں اور کوئی ایک دوسرے کو نہیں پکڑ سکتا۔

یہ بھی خلیفہ کی جدت یا جودت تھی کہ انہوں نے تین مرتبہ حیدرآباد کو خدا حافظ کہا اور تینوں مرتبہ اپنا تمام اثاثہ (جن میں وہ حراج والی تصویریں بھی شامل تھیں) فروخت کر دیا۔ ایک مرتبہ تعلیمی رخصت پر یورپ کا سفر، پھر سرینگر میں مہاراجہ کالج کی صدارت، غرض ہر مرتبہ لغوی اور اصطلاحی دونوں اعتبار سے خلیفہ "سبکدوش" ہو کر یہاں سے گئے۔ ایک بہت بڑا بنگلہ بنا لیا تھا وہ بھی فروخت کر دیا۔ اسٹاف اور طلبہ دونوں میں ہر دلعزیز تھے اس لیے ہر مرتبہ رخصتانے ہوئے، دعوتیں ہوئیں، عصرانے ہوئے۔ سرینگر کی ملازمت پسند نہیں آئی تو حیدرآباد واپس لوٹے اور یہاں میر شعبہ فنون (ڈین فیکلٹی آف آرٹس) مقرر ہوئے۔

۱۹۴۶ء میں میں نے نظام کالج کی پرنسپلی سے وظیفہ لے کر دہلی کے اینگلو عربک کالج کی پرنسپلی کا جائزہ لیا۔ وہاں ۱۹۴۷ء کے خوں چکاں زمانے تک رہا۔ اس کے بعد دستور ساز اسمبلی کی ایک ذیلی مجلس کے ممبر کی حیثیت سے پانچ مہینے دہلی میں قیام کرنا پڑا۔ جون ۱۹۴۸ء میں واپس حیدرآباد ہوا تو حکومت حیدرآباد کے ایما سے میری بازماموری جامعۂ عثمانیہ میں ہوگئی اور مجھ سے شعبۂ سیاسیات کی تنظیم کے لیے کہا گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ خلیفہ میر شعبۂ فنون بنے بیٹھے ہیں۔ سیاسیات کے شعبے کا وجود ہی نہ تھا اس لیے اس کے لیے نہ لیکچر روم نہ اسٹاف نہ صدر شعبہ کے لیے کوئی کمرہ۔ میں نے خلیفہ سے کہا کہ بھائی میں کہاں بیٹھوں۔ کہنے لگے کہ تم اور مجھ سے پوچھو جہاں جگہ ملے بیٹھ جاؤ اور نہ ملے تو نکال لو!! جگہ نہیں تھی اس لیے کہیں نہ کہیں سے مجھے نکالنی پڑی!

چند مہینے بعد خلیفہ وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو گئے۔ انہوں نے کبھی بھی اس کو نہیں چھپایا کہ وظیفے کے بعد وہ پاکستان جا رہے ہیں۔ طلبہ نے انہیں رخصتانہ عصرانہ دیا اور جس روز وہ حیدرآباد سے جا رہے ہیں اس روز وائس چانسلر انہیں

خدا حافظ کہنے آئے۔

جیسا میرے عزیز دوست شاہد حسین رزاقی صاحب نے رسالہ ثقافت میں لکھا ہے، خلیفہ کے جوہر عمر کے آخری حصے میں کھلے۔ میں مارچ ۱۹۵۲ء میں کامن ویلتھ ریلیشنز کانفرنس میں ہندوستانی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے لاہور گیا تھا۔ کانفرنس ختم ہونے کے بعد پہلا کام میں نے یہ کیا کہ خلیفہ سے ملنے ۲ وارث روڈ گیا۔ اپنے آنے کی میں نے انہیں پہلے سے کوئی اطلاع نہیں کی تھی۔ رات کے وقت باہر کے باغیچے میں کتاب دیکھ رہے تھے۔ دیکھتے ہی لپٹ گئے۔ پرانے قصے یاد دلائے۔ حیدرآباد میں ہر ایک کا حال دریافت کیا۔ دوسرے دن مجھے کراچی جانا تھا اس لیے ان سے صرف ایک ہی مرتبہ ملاقات ہو سکی۔ ستمبر ۱۹۵۵ء میں میرا پھر لاہور جانا ہوا۔ اس مرتبہ خلیفہ سے کئی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ اپنا ادارہ دکھایا۔ وہاں کے سب کارکنوں سے ملایا۔ شیخ محمد اشرف صاحب کے یہاں عصرانے پر اور بیگم رفیع کے یہاں عشائیے پر ملاقات ہوئی۔ شاید آخری مرتبہ میں نے خلیفہ کو حمید الظفر صاحب کے یہاں ظہرانے پر دیکھا۔ نہ جانے کیوں چلتے وقت میرے اوپر ایک خاص اثر تھا۔ اور یہ خیال تھا کہ شاید اب ملاقات نہ ہو۔ ۱۹۵۵ء میں خلیفہ صاحب کی طبیعت میں میں نے بدیہی فرق پایا۔ ان کی بذلہ سنجی اور شاید حاضر جوابی کی بھی وہ کیفیت نہیں رہی تھی جو جامعہ عثمانیہ کے دور میں نمایاں تھی اور اس کے بجائے ان کے چہرے بشرے سے ایک عالمانہ کیفیت مترشح ہوتی تھی۔ میں نے کہا کہ ہندوستان میں تمہاری کتابوں، خاص کر اسلامک آئیڈیالوجی اور فکر اقبال کی کافی مانگ ہے۔ تو اس سے بہت خوش ہوئے۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے قیام میں جو دقتیں پیدا ہوئیں انہیں تفصیل سے بیان کیا اور کہا انشاء اللہ آئندہ اس کام کو اس سے بھی زیادہ پھیلایا جائے گا۔

ہمارے پہلے ثالوث میں سے وحید الرحمٰن اور خلیفہ دونوں چل بسے، بلکہ شاید ان لوگوں میں سے جو کلیہ جامعہ عثمانیہ کے افتتاح کے موقع پر ۲۰ راگست ۱۹۱۹ء میں موجود تھے ان میں شاید میں ہی تن تنہا اس دنیائے فانی میں رہ گیا ہوں۔ رہے نام اللہ کا۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی یاد میں

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد ہی حیدرآباد تشریف لے آئے تھے اور صدر شعبہ فلسفہ کی حیثیت سے انہوں نے اپنی قابلیت اور ذہانت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بٹھا دیا تھا۔

میرا تقرر عثمانیہ یونیورسٹی میں ستمبر سنہ ۱۹۳۰ء میں ہوا۔ حیدرآباد جانے کے چند روز بعد ہی مولوی عبدالحق صاحب کے یہاں خلیفہ صاحب سے پہلی مرتبہ ملنے کا موقع ملا۔ وہ میرے بڑے بھائی عابد حسین خاں صاحب مرحوم کے علیگڈھ میں ہم جماعت رہ چکے تھے اس لیے مجھ سے بڑی شفقت سے ملے اور یہ شفقت ان کی آخر تک برقرار رہی۔ میں بھی ان کا ادب کرتا تھا لیکن خلیفہ صاحب کا مزاج کچھ ایسا تھا کہ وہ بڑے چھوٹے کا زیادہ لحاظ نہیں کرتے تھے۔ بذلہ سنجی کی ترنگ میں وہ کسی کو نہیں چھوڑتے تھے اور خود اپنے اوپر بھی وہ بعض اوقات پھبتی کس دیتے تھے۔ جس محفل میں بیٹھتے تھے سب کی توجہ کا مرکز بن جاتے تھے۔ شگفتہ مزاجی کا یہ حال تھا کہ اگر انہیں مستقل باغ و بہار کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا

میں خلیفہ صاحب کو اپنی پیڑھی کے ذہین ترین افراد میں شمار کرتا ہوں۔ ان کی بذلہ سنجی دراصل ان کی بے پناہ ذہانت اور جودت طبع کی رہین منت تھی۔ ٹھس قسم کا آدمی چاہے وہ کتنا ٹھوس ہو بذلہ سنج نہیں ہو سکتا۔ پھر خلیفہ صاحب میں ایک بات یہ تھی کہ وہ کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ سب نے دیکھا ہے کہ جب ڈاکٹر رادھا کرشن اور ان کے دوسرے ساتھی یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن کے سلسلے میں حیدرآباد آئے تو خلیفہ صاحب کی بذلہ سنجی کا ان اصحاب کے ساتھ بھی وہی انداز تھا جس انداز کے ہم لوگ عادی تھے۔ ایک زمانے میں سر اکبر حیدری کا حیدرآباد میں طوطی بولتا تھا۔ جب کبھی وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے اسٹاف کلب میں آتے تو خلیفہ صاحب ان سے اسی طرح بے تکلفی سے گفتگو کرتے جس طرح وہ دوسروں سے معمولاً کیا کرتے تھے۔ یہ نہیں کہ دوسروں کی طرح وہ احتیاط سے بات کریں، اونچ نیچ دیکھ کر اور ناپ تول کر کے۔ اسی بے تکلفی کی وجہ سے حیدرآباد کے نواب لوگوں میں انہیں کبھی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔

وہ لوگ جن کا خیال ہے کہ فلسفے کے پروفیسر اور محقق کو بڑا ہی سنجیدہ اور نہایت ہی خشک انسان ہونا چاہیئے انہیں خلیفہ صاحب سے مل کر مایوسی ہوتی تھی۔ ان بے تخیل اصحاب کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ فلسفہ اور

خوش مذاقی ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں۔ فلسفے کے محقق ہونے کے علاوہ خلیفہ صاحب کو ادب عالیہ کا بھی ذوق تھا۔ انگریزی، فرنچ اور جرمن ادب پر ان کی بڑی وسیع نظر تھی۔ فرنچ ادیبوں کے متعلق ان سے اکثر گفتگو رہا کرتی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ ان کی رائے ادبی تخلیقات کے متعلق کس قدر متوازن اور صائب تھی

جس زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کا اسٹاف کلب نوبت پہاڑ کے دامن میں واقع تھا تو شام کو ٹینس کے بعد بیٹھک ہوا کرتی تھی۔ کبھی علمی اور ادبی گفتگو ہوتی کبھی ملکی اور مقامی سیاست پر تنقید ہوتی اور کبھی پھکڑ چلتا، خالص پھکڑ جس میں کسی دوسرے محرک کی آمیزش نہ ہوتی۔ ان محفلوں میں خلیفہ صاحب کی ذات کو مرکزی حیثیت حاصل تھی خلیفہ صاحب کا خطاب اکثر ڈاکٹر عبدالحق مرحوم سے رہتا جو عربی کے عثمانیہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ تھے اور نہایت فاضل شخص تھے۔ وہ بھی پھکڑ میں خلیفہ صاحب سے کم نہ تھے۔ ان کا رنگ گہرا سیاہ تھا ایسا سیاہ کہ جس میں کچھ اودا پن آجاتا ہے۔ خلیفہ صاحب بڑے ہی سُرخ سفید انسان تھے۔ کلب والے دونوں کو بلیک اینڈ وہائٹ کہا کرتے تھے۔ رنگ روپ میں دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے لیکن پھکڑ کی حد تک دونوں کی شخصیتوں میں اتحاد تھا۔ جب ان دونوں میں نوک جھونک ہوتی تو کلب کے دوسرے ممبر تماشہ بینوں کی طرح لطف اندوز ہوتے اور خاموش رہتے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ معاملہ برابری کا ہے۔ ممکن ہے کبھی ایسا ہو جائے کہ ایک سیر تو دوسرا سوا سیر۔ اسٹاف کلب جب نوبت پہاڑ سے اٹھ کر پہلے حیدر گوڑہ اور پھر اڈکمیٹ چلا گیا تو یہ محفلیں منتشر ہو گئیں۔ ان محفلوں کی یاد عرصے تک لوگوں کے دلوں میں رہی۔ کئی مرتبہ کوشش کی گئی کہ پرانا نقشہ جمے لیکن نہیں جما۔ ملک کی تقسیم کے بعد تو یہ انتشار مکمل ہو گیا۔ ان محفلوں کی یاد اب تک دلوں کو مسوستی رہی ہے

خلیفہ صاحب کی بذلہ سنجی میں بلا کی اُپج اور جدّت تھی۔ ان کے مزاج میں کبھی تلخی نہیں ہوتی تھی۔ ان کا مذاق اکثر پروفیسر ہارون خانصاحب شیروانی سے بھی رہتا تھا جو ان کے پرانے ساتھی تھے۔ دونوں نے ایک ہی دن عثمانیہ یونیورسٹی کے اسٹاف میں شرکت کی۔ خلیفہ صاحب کہا کرتے تھے کہ دونوں کی شادی بھی ایک ہی تاریخ میں ہوئی۔ مجھے علم نہیں کہ مذاق میں کہتے تھے یا یہ امر واقعہ تھا۔ پروفیسر ہارون خانصاحب شیروانی بعض دوسرے اصحاب کے مذاق کی تاب نہ لا کر اکثر اوقات غصے ہو جاتے اور اٹھ کر چلے جاتے۔ لیکن خلیفہ صاحب کے مذاق سے وہ بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہی باتیں جو خلیفہ صاحب کہتے تھے اگر کوئی دوسرا کہتا تو پھر اس کی خیر نہ ہوتی۔ لیکن خلیفہ صاحب کی بات کا انداز کچھ ایسا تھا کہ وہ ان سے کبھی ناراض نہیں ہوئے۔ میں نے کئی مرتبہ پروفیسر ہارون خانصاحب شیروانی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "کبھی خلیفہ کی بات میں ڈنک نہیں ہوتا" پروفیسر ہارون خانصاحب شیروانی سے گذشتہ مرتبہ جب علیگڈھ میں ملاقات ہوئی تو میں نے دیکھا کہ خلیفہ صاحب کا جب ذکر آیا تو ان کی آنکھیں اشک آلودہ ہو گئیں۔

اسٹاف کلب کی محفلوں کے علاوہ بھی مجھے خلیفہ صاحب کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں حیدر گوڑہ میں ان کے پڑوس میں رہتا تھا۔ چھٹی کے روز میں اکثر ان کے یہاں جاتا اور کبھی وہ بھی میرے یہاں تشریف لاتے۔ یہاں ان کی گفت گو کا انداز بالکل جداگانہ ہوتا۔ شگفتہ مزاجی تو ان کی فطرت میں تھی اور فلسفیانہ یبوست کی ان سے توقع کسی حالت میں بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ جس طرح بذلہ سنجی میں وہ بات میں بات نکالتے اسی طرح جب علمی اور فلسفیانہ مسائل پر گفت گو کرتے تو معنی آفرینی کی عجیب عجیب صورتیں نظر آتیں۔ ہر بات میں ان کی غیر معمولی خداداد ذہانت کا اظہار ہوتا۔ دوسروں کے چبے چبائے نوالوں سے احتراز کرتے اور جو بات کہتے اس میں ذاتی اپج اور اجتہاد کا رنگ ہوتا۔ ان کی نظر مغربی اور اسلامی فلسفے پر بہت وسیع تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انہوں نے دونوں کا تقابلی مطالعہ بڑی گہری نظر سے کیا ہے۔ فلسفے اور ادب پر انہوں نے بہت پڑھا تھا اور ان سے متعلق کوئی ایسا دقیق سے دقیق مسئلہ نہ تھا جس پر وہ رائے نہ رکھتے ہوں۔ پھر ان کی یہ رائے محض اوپری معلومات پر مبنی نہ تھی جیسے کہ اکثر لوگوں کی ہوا کرتی ہے وہ مسائل کی تہ تک پہنچتے اور گفت گو کے دوران میں اپنی ذہانت سے بہت سی ایسی ضمنی باتوں کی نشاندہی کرتے جن پر عموماً لوگوں کی نظر نہیں پڑتی۔ چونکہ فلسفہ و ادب سے مجھے بھی شغف تھا اس لیے یہ گفتگو میں بعض اوقات گھنٹوں جاری رہتیں اور پھر بھی کم از کم مجھے سیری نہ ہوتی۔ چونکہ مجھ پر شفقت فرماتے تھے اس لیے کہتے تھے "بھئی آپ کو تاریخ کے شعبے کے بجائے فلسفے کے شعبے میں ہونا چاہیئے" یہ بات کئی مرتبہ انہوں نے مجھ سے کہی جسے میں نے ہمیشہ ان کی شفقت پر محمول کیا۔
فلسفۂ اسلام پر تحقیق کے سلسلے میں عربی پڑھنے کا شوق ہوا تو مولانا مامون کو عرصے تک اپنے مکان پر رکھا تاکہ ان سے عربی پڑھیں اور عربی زبان میں گفتگو کریں۔ خود مولانا مامون نے مجھ سے کہا کہ خلیفہ صاحب اتنی جلد عربی سیکھ رہے ہیں کہ شاید کوئی دوسرا ہندوستانی نہیں سیکھ سکے گا انہوں نے عربی زبان میں اتنی استعداد پیدا کرلی تھی کہ وہ بلاتکلف عربی کتابیں پڑھ اور سمجھ سکتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان جانے کے بعد غالباً انہوں نے اپنی عربی کی استعداد اور زیادہ بڑھالی تھی۔

جب میں خلیفہ صاحب سے ان کے مکان پر ملا کرتا تھا تو اکثر وہ مجھے اپنے کمرہ استراحت میں بلالیا کرتے تھے ان کا بیڈ روم اور لائبریری ایک ہی جگہ تھی۔ ان کے پاس کئی فائل تھے جن میں انہوں نے اسلامی تہذیب و تمدن کے متعلق نوٹس جمع کئے تھے۔ بعض اوقات مجھے یہ نوٹس سناتے اور ان پر گفت گو رہتی۔ یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ میں ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ ان نوٹس کو تہذیب و ترتیب کے بعد شائع کیوں نہیں کر دیتے کہتے کہ ہاں اس کا بھی وقت آئے گا۔ مجھے یہ دیکھ کر بیحد مسرت ہوئی کہ پاکستان جانے کے بعد ان کی تخلیقی صلاحیت جو حیدرآباد میں کچھ گھٹ کے رہ گئی، پوری طرح بروئے کار آئی اور انہوں نے دس بارہ سال کے عرصے میں نہایت اعلیٰ پایہ کی متعدد تصانیف شائع کیں جو فلسفۂ تمدن اور شعر و ادب دونوں پر حاوی ہیں۔ پھر اس کے علاوہ انہوں نے اسلامی ثقافت کا جو ادارہ قائم کیا وہ بھی ان کی زندہ یادگار ہے۔ جس طرح اب تک یہ ادارہ اسلامی علوم و فنون کی خدمت کرتا رہا ہے اسی طرح دعا ہے کہ آیندہ بھی یہ خدمت انجام دیتا رہے یہ ادارہ خلیفہ صاحب کا بہترین عطیہ ہے جو انہوں نے اپنی مملکت پاکستان کی نذر کیا ہے۔

ڈاکٹر انور اقبال قریشی

خلیفہ مرحوم کی زندگی کا یادگار دَور

خلیفہ عبدالحکیم صاحب سے میری پہلی ملاقات عثمانیہ یونیورسٹی کے کلب میں ۲۶ جون ۱۹۳۶ء کی شام کو ہوئی۔ موسم گرما کی تعطیلات کے بعد یونیورسٹی کے کھلنے کا یہ پہلا دن تھا اور یونیورسٹی میں میری ملازمت کا بھی روز اول تھا۔ میرا تقرر بطور صدر شعبۂ معاشیات عمل میں آیا تھا اور میں اسی روز سیدھا جالندھر سے حیدرآباد پہنچا تھا۔ لیکن میری "شہرت" میرے آنے سے بہت پہلے پہنچ چکی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میری آمد کے خلاف جامعہ میں اچھا خاصا محاذ قائم کر دیا گیا تھا۔ ایک تو اس زمانہ میں ملکی اور غیر ملکی کا مسئلہ اس قدر شدت اختیار کر چکا تھا کہ کسی غیر ملکی کا تقرر یوں ہی ممکن نہ تھا اور میری یہ بھی بدقسمتی تھی کہ خود جامعہ کے اندر چند نہایت با اثر اساتذہ کے حقوق میرے تقرر سے متاثر ہوئے تھے۔ ان لوگوں کو دربار تک رسائی حاصل تھی لہٰذا انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ میرا تقرر عمل میں نہ آئے۔ ملکی تحریک کی شدت کے باوجود خود ملکی حلقوں میں اس بات کا احساس تھا کہ جامعہ میں بہترین استادوں کا تقرر ہونا چاہیئے۔ اس وقت حکومت کی باگ ڈور سر اکبر حیدری کے ہاتھوں میں تھی اور انہی کے ایما پر باوجود سخت مخالفت کے میرا تقرر عمل میں آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یونیورسٹی کے حلقوں میں میری آمد سے پہلے میرا خاصہ چرچا ہو چکا تھا۔ جس سے خلیفہ صاحب بخوبی واقف تھے۔

اسی شام جب یونیورسٹی کلب میں ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو مجھے دیکھتے ہی خود بخود ہنس کر کہنے لگے میاں تم سے تو مل کر مجھے کچھ مسرت نہیں ہوئی۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ جو شخص ڈبلن یونیورسٹی میں لکچرار رہا ہو اور ریزرو بینک کی جس نے افسری کی ہو وہ کوئی بہتر قسم کا آدمی ہوگا لیکن تم تو مجھے بالکل طفلِ مکتب نظر آتے ہو۔ کلب کی مجلس بھری ہوئی تھی سب لوگوں کی نظریں دفعتہً میری طرف اٹھ گئیں اور میں کچھ جھینپ سا گیا اور کوئی جواب بن نہ پڑا۔

خلیفہ صاحب بہت بامذاق آدمی تھے لیکن ان کی ہر دلعزیزی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے مذاق میں طنز تو ضرور ہوتا تھا لیکن طعن کبھی نہ ہوتا۔ بات جب کرتے تھے تو چہرہ پہ ہمیشہ دل کش مسکراہٹ ہوتی تھی جس میں محبت اور خلوص کا پہلو نمایاں ہوتا۔ یہی پہلا مذاق باقی عمر بھر کی دوستی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ میرے دل نے فوراً یہ محسوس کر لیا کہ سارے کلب میں یہ واحد شخص ہے جو میرے تقرر سے دلی طور سے خوش ہے اور اس بات پر مفتخر ہے کہ اس کے وطن کے ایک مسلمان نوجوان کو زندگی کے اوّلین منازل ہی میں یہ اعزاز حاصل ہوا ہے۔

خلیفہ صاحب سے اگرچہ یہ میری پہلی ملاقات تھی لیکن ان سے غائبانہ تعارف تھا۔ وہ جامعہ کے مشہور پروفیسر تھے اور ان کی علمی شہرت حیدر آباد سے باہر پھیل چکی تھی۔ میرے ذہن میں ان کا ابتدائی تصور ایک عجیب قسم کے دبلے پتلے اور دنیا و مافیہا سے بے خبر پروفیسر کا تھا اور یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ آئی تھی کہ عبدالحکیم صاحب ایک خوش رو، خوش وضع، سرخ و سپید تومند اور جامہ زیب اور نہایت خوش مزاج و مخلص انسان ہوں گے۔ عمر کے فرق کے باوجود اسی شام سے ان سے دوستی قائم ہو گئی اور دن بدن بڑھتی گئی، اور حالات کچھ ایسے سازگار ہوئے کہ ہمارے پورے خاندان دوستی کے اس رشتہ میں منسلک ہو گئے۔ میری اکلوتی بچی بشریٰ ان کی بچی رفیعہ کی ہم جماعت تھی اور وہ دونوں بالکل بہنیں بن گئیں اور جب میری بیوی کی ملاقات بیگم خلیفہ سے ہوئی تو ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ ہم سے بھی بڑھ گیا اور بفضل تعالیٰ اب تک جاری ہے۔

عام پڑھنے والوں کو ان خانگی تعلقات سے چنداں دلچسپی نہ ہوگی اور میں ان کا ذکر بھی نہ کرتا لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر اس ماحول کا ذکر نہ کیا جاتا تو آیندہ بعض تفصیلات کی جن کا ذکر آئے گا پوری طرح وضاحت نہیں ہو سکتی تھی۔ خلیفہ کے دوست احباب واقعی لاتعداد ہیں۔ وہ اس قدر مرنجاں مرنج آدمی تھے کہ جو شخص ایک دفعہ ان سے مل لیتا ہمیشہ ان کا دم بھرتا۔ لیکن ان لوگوں کی تعداد جو ان کی زندگی کے ہر پہلو سے آگاہ ہوں اور جنہوں نے اپنی عمر کا ایک حصہ گزارا ہو زیادہ نہیں ہے۔

جون ۱۹۲۷ء سے لے کر ستمبر ۱۹۴۶ء تک، جب تک کہ میں حیدر آباد میں رہا شاید ہی کوئی صبح یا شام ایسی گزری ہو جب خلیفہ صاحب سے ملاقات نہ ہوئی ہو۔ ہمارے گھر ایک دوسرے کے بالکل قریب تھے خلیفہ صاحب کا اپنا ذاتی بنگلہ بہت شاندار تھا۔ اس وقت حیدر آباد میں جرمن ڈیزائن بنگلوں کا رواج تھا جو بہت مقبول تھے۔ لیکن میرے خیال میں یہ گھر گرم ممالک کے رہنے والوں کے لیے چنداں موزوں نہ تھے۔ خلیفہ صاحب کا مکان مجھے اس لیے پسند آیا کہ یہ مغلوں کی عمارتوں کے طرز پر بنایا گیا تھا جس میں کھلے کھلے برآمدے اور خوبصورت محراب اور ستون تھے۔ اس گھر میں آٹھ ہزار گز زمین تھی اور پانی کثرت سے ملنے کی وجہ سے ان کا خانہ باغ بہت شاداب تھا۔ یونیورسٹی ہمارے گھر سے دور تھی (ان دنوں چار میل کا فاصلہ بھی بہت دور سمجھا جاتا تھا) لہٰذا ہم دونوں باری باری ایک موٹر میں جاتے تھے اور دوسری موٹر بچوں کو اسکول لے جانے یا بیگمات کے لیے مخصوص رہتی۔ اکثر و بیشتر اہم چیزوں میں ہم دونوں کی طبیعتوں کا میلان یکساں تھا خلیفہ صاحب دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرنے کے ہی نہیں بلکہ سونے کے عادی تھے۔ میری یہ انتہائی کمزوری کہیے یا راسخ عادت کہ اگر دوپہر کی نیند نہ ملے تو میں پھر کام ہی نہیں کر سکتا۔ انگلستان جیسے سرد ملک میں بھی طالب علمی کے زمانے اور سردی کے موسم میں بھی دوپہر کا سونا نہ چھوٹتا۔ چنانچہ یونیورسٹی میں جب کبھی تیسرے پہر میں کوئی میٹنگ کرنے کا سوال پیدا

ہوتا تو میری اور خلیفہ صاحب کی رائے ہمیشہ اس کے خلاف ہوتی اور ہمیں کامیابی اس لیے ہو جاتی کہ ہم صاف کہہ دیتے کہ اس صورت میں ہم شرکت سے معذور ہیں۔ جب خلیفہ صاحب کو شروع شروع میں میری اس عادت کا پتہ چلا تو بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے میاں بس اب ہماری دوستی پکی ہو گئی تم بہت سمجھ دار آدمی معلوم ہوتے ہو۔ جو شخص دوپہر میں آرام نہیں کرتا وہ اپنی زندگی سے دشمنی کرتا ہے۔

شام کو ہم دونوں مغرب کے قریب اکٹھے یونیورسٹی کلب جایا کرتے تھے۔ خلیفہ صاحب پیدل چلنے کے چنداں شوقین نہ تھے۔ اگرچہ تھوڑا سا ٹہلنا ضرور پسند کرتے تھے۔ میں بھی اس معاملے میں سخت تن آسان واقع ہوا ہوں۔ کلب ہمارے گھر سے تقریباً ڈیڑھ میل تھا۔ چنانچہ دستور یہ تھا کہ اکثر کلب پیدل جاتے اور واپسی کے لئے موٹر منگوا لیتے۔ موٹروں میں جانے اور آنے کا تو اکثر اتفاق ہوتا تھا لیکن دونوں طرف پیدل چلنے کا موقع کبھی نہ آیا۔

خلیفہ صاحب کا گھر بچوں اور بیگمات کے لیے کلب کا کام دیتا تھا یعنی یہاں کم و بیش ہر روز ان کی محفلیں جمتی تھیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کلب اپنی نوعیت کا ایک ہی کلب تھا جس کا بدل آج تک کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ حیدرآباد چھوڑنے کے بعد یہی افسوس رہا کہ اور تو سب چیزوں کی تلافی ہو گئی لیکن یونیورسٹی کلب کا نعم البدل نہیں ملا۔ اور نہ ملنے کی توقع ہے۔ اس کلب کی سب سے نادر خوبی گپ تھی۔ گپ اور محض خالص گپ۔ لیکن اس گپ کا معیار بہت اونچا ہوتا تھا۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ بازی کے علاوہ حالاتِ حاضرہ پر بہت دلچسپ تبصرہ ہوتا تھا۔ تمام جنگ کے دوران میں حالاتِ جنگ پر جو سیر حاصل تبصرہ اس کلب میں ہوتا وہ دنیا کے اچھے سے اچھے اخبار میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ بعض زندہ دل اراکین اس کے لیے خاص طور پر تیار ہو کر آتے تھے اور دنیا بھر کے ریڈیو اسٹیشنوں سے الگ الگ خبریں اور تبصرے سنتے تھے اور پھر کلب میں اس پر تنقید ہوتی تھی۔ میں اور خلیفہ صاحب دو ایسے اراکین تھے جو اپنے گھروں میں ریڈیو بہت کم سنتے تھے۔ اور زیادہ تر کلب کے تبصرے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ ہر شام کلب میں مستقل آنے والوں کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ جو لوگ محض ٹینس کھیلنے کے لیے آتے تھے وہ جلد ہی آتے اور جلدی چلے جاتے۔ اصل مجلس مغرب کے بعد جمتی اور شب تک ختم ہو جاتی۔ اس کلب کی ایک خاص چیز "ایک رکابی ڈنر" تھا۔ میں نے سنا ہے کہ اس کی نقل اور جگہ بھی گئی لیکن وہ بات پیدا نہیں ہوئی۔ ڈنر والی رات تقریباً بیس اصحاب ہوتے تھے اور اس میں زیادہ تر وہی لوگ شریک ہوتے جو باقاعدہ کلب آتے تھے۔ ویسے تو کلب کے جملہ اراکین کی تعداد سو سے اوپر تھی۔ یہ ڈنر بالکل غیر رسمی ہوتا تھا اور اراکین کو اس کی اطلاع دینے کا کوئی قاعدہ نہ تھا۔ کھانے پینے کے لحاظ سے حیدرآباد کا معیار تمام ہندوستان سے اونچا تھا۔ اچھے گھرانوں میں مختلف کھانوں کے ماہر کئی کئی باورچی رکھے جاتے تھے۔ اس بارے میں حیدرآبادی بیگمات بھی بہت سلیقہ مند تھیں اور عمدہ کھانے پکانے میں ید طولیٰ رکھتی تھیں۔ دستور یہ تھا کہ اگر بیس احباب کھانے میں شریک ہوتے تو صرف دس احباب کو کھانا لانے کی زحمت دی جاتی تھی اور باقی

دس اس مرتبہ کچھ نہ لاتے تھے۔ اگلے مہینے میں یہ دس کچھ نہ لاتے اور دوسرے دس احباب کھانا لاتے تھے۔ کھانے کا ایک باقاعدہ مینو تیار ہوتا تھا۔ کلب والوں کو خوب معلوم تھا کہ کس کے گھر میں کونسی چیز خصوصیت سے اچھی پکتی ہے اور وہی چیز اس کے ذمہ ڈالی جاتی تھی۔ خلیفہ صاحب کے ہاں شب دیگ بہت عمدہ پکتی تھی۔ دکنی گھرانوں میں میٹھوں اور حلووں کا معیار بہت اونچا ہوتا تھا۔ مجھے کئی بادشاہوں کے یہاں بھی کھانے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ بڑے بڑے جہازوں اور یورپ کے اعلیٰ ترین ہوٹلوں میں بھی کھانا کھایا ہے لیکن جس معیار کا ایک رکابی ڈنر عثمانیہ کلب میں ہوتا تھا ویسا ڈنر آج تک نصیب نہیں ہوا۔ کھانے کے بعد خلیفہ صاحب سے ہمیشہ شعر سنانے کی فرمائش کی جاتی تھی۔ اور عموماً یہ محفل ایک مختصر مگر منتخب مشاعرہ کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔

خلیفہ صاحب سے ملاقات سے پہلے مجھے یہ زعم تھا کہ میں بہت پڑھنے والے آدمیوں میں سے ہوں کیونکہ میں اوسطاً سو صفحے روز پڑھتا تھا لیکن میرا مطالعہ زیادہ تر معاشیات تک ہی محدود تھا۔ خلیفہ صاحب کا دستور یہ تھا کہ وہ صبح سویرے اٹھتے اور ناشتے تک اپنے کمرہ میں مطالعہ کرتے۔ ناشتے کے بعد وہ ایک آرام کرسی پر درخت کے نیچے باغ میں بیٹھ جاتے اور ساڑھے دس بجے تک پڑھتے رہتے۔ پھر یونیورسٹی جانے کا وقت ہو جاتا۔ دوپہر میں آرام کے بعد وہ عصر کے وقت باغ میں آ کر پھر اسی کرسی پر ڈٹ جاتے اور مغرب سے ذرا پہلے تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ پھر کلب چلے جاتے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر تک ڈرائنگ روم میں گپ شپ رہتی اور پھر سونے سے پہلے ایک آدھ گھنٹہ ضرور مطالعہ میں صرف کرتے۔ اتوار یا دوسری تعطیلات میں (جو حیدرآباد میں کثرت سے ہوتی تھیں) زیادہ وقت باغ میں آرام کرسی پر ہی پڑھنے میں گزارتے تھے جو ملاقاتی آ جاتا وہ بھی پاس کی کرسی پر بیٹھ جاتا۔ تعطیلات کے زمانے میں پڑھنے کے لیے کافی وقت مل جاتا تھا۔ اور ویسے بھی روزانہ اوسط چار پانچ گھنٹے سے کم نہ تھا۔ بظاہر یہ کوئی غیر معمولی مطالعہ نظر نہیں آتا لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ یہ اوسط سال کے ۳۶۵ دن برابر جاری رہتا تھا خواہ اتوار ہو یا کوئی تہوار اور تعطیلات کے چار مہینوں میں مطالعہ کا وقت بہت بڑھ جاتا تھا تو پھر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس اوسط کی برابری کرنا آسان کام نہیں ہے۔

خلیفہ صاحب نے پڑھنے کے مقابلہ میں لکھا بہت کم ہے۔ حیدرآباد میں قیام تک تو انہوں نے بعض کتابوں کے ترجمے اور چند علمی مقالوں کے علاوہ اور کچھ نہیں لکھا۔ ان کی تمام تر تصانیف پروفیسری سے ریٹائر ہونے کے بعد کی ہیں۔ جب کہ وہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے ڈائرکٹر ہو گئے تھے۔ میں حیدرآباد میں برابر لکھتا رہتا تھا اور اکثر و بیشتر ان سے صلاح مشورہ لیتا تھا۔ وہ میرے مسودات بہت دلچسپی اور توجہ سے پڑھتے تھے اور اکثر میرے قلم کی سختی کو نرم کر دیتے تھے۔ لیکن میں جب کبھی انہیں خود لکھنے پر اصرار کرتا تو وہ نہایت عمدگی سے ٹال دیتے اور کہتے میاں تمہارا مضمون

دال روٹی کا ہے ہو وہ قم جبزی ترکاری کے بھاؤ لکھ کر آسانی سے چھوٹ جاتے ہو۔ دراصل ان کی نظر اتنی وسیع اور ان کا اپنا معیار اس قدر بلند تھا کہ وہ کوئی ایسی چیز لکھنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے جو خود ان کے معیار کے مطابق نہ ہو۔ خلیفہ صاحب کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور ان کی نظر بہت عمیق تھی۔ وہ صحیح معنوں میں ان محدودے چند آدمیوں میں سے تھے جو مفکر کہلا سکتے ہیں۔ اور یہ کہنا غلط نہیں کہ وہ اس زمانے میں ہندوستان و پاکستان کے سب سے زیادہ پڑھے لکھے آدمی تھے۔

۱۹۵۶ء کے شروع میں امریکہ کی انڈیانا یونیورسٹی نے خلیفہ صاحب کو کمنووکیشن ایڈریس پڑھنے کی دعوت دی تھی اور امریکہ کے علمی حلقوں میں اس ایڈریس کو بہت اہمیت دی گئی۔ میں ان دنوں واشنگٹن میں مقیم تھا۔ اسی دوران میں انہوں نے امریکہ کا دورہ کیا اور جابجا لکچر دیئے۔ واپسی پر میرے پاس ٹھہرے اور امریکہ میں حیدرآباد کی یاد تازہ ہو گئی۔ میں نے امریکہ کے متعلق ان کے تاثرات دریافت کیے تو کہنے لگے ان لوگوں نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ دوپہر کے کھانے کی دعوت دیتے ہیں اور کھانے کے بعد آرام کی بجائے لکچر دینے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان داموں پر یہ سودا مہنگا ہے۔ اس لیے میں جلدی واپس آگیا ہوں تاکہ تمہارے ہاں دوپہر کے کھانے کے بعد کم سے کم آرام تو کر سکوں۔

بیگم خدیجہ حکیم

رفیقِ زندگی کی یادیں

یہ اس انسان کی قابلِ رشک زندگی کے چند پہلو ہیں جو واقعی اسم بامسمیٰ تھا اور جس کے حکیمانہ اندازِ فکر و زیست کو میں نے ایک رفیقۂ حیات کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں اپنے تجربہ کی بنا پر حکیم صاحب کی زندگی پر مجموعی طور سے روشنی ڈالوں تو اس طرح ان کی گھریلو زندگی کی خصوصیات بھی نمایاں ہو سکتی ہیں کیونکہ وہ ان انسانوں میں سے تھے جن کی پوری زندگی خاص خاص اصولوں اور فلسفۂ حیات کی پابند ہوتی ہے۔ ان کا رویہ اور اخلاق کچھ ایسا ہمہ گیر تھا کہ نہ صرف گھر والے اور دوست احباب بلکہ نوکر چاکر، امیر غریب، اپنے پرائے اور ہر وہ شخص جس کا کہ ان سے ذرا بھی واسطہ رہ چکا ہو اس کی گواہی دے سکتا ہے۔ ان کا انداز گھر والوں اور باہر والوں دونوں کی نسبت کافی حد تک یکساں تھا۔ لیکن باوجود اس یکسانیت کے ان کے بیوی بچوں، قریبی عزیزوں اور مخلص دوستوں سے ان کا گہرا جذباتی تعلق بھی تھا اور ان کے دل میں ان کی بے حد قدر تھی۔ انتہائی علم دوستی کے باوجود وہ محض خشک فلسفی نہ تھے بلکہ زندگی اس طرح گزارتے تھے کہ اس کی نعمتوں اور خوشیوں سے محظوظ ہوتے تھے اور کیوں نہ ہوتے جب کہ یہ خوشیاں انہیں اپنے اخلاص کے صلے میں ملتی تھیں۔ وہ جب بھی کسی سے ملتے تو اس کو اپنی شیریں بیانی اور خلوص سے اپنا گرویدہ بنا لیتے اور اگر ان سے کسی ذاتی یا علمی مسئلہ پر رائے مانگی جاتی تو بڑی خوشی سے اظہارِ خیال کرتے اور بیشتر اوقات ان کی رائے درست ثابت ہوتی کیونکہ ان کی نگاہ اپنے وسیع مطالعے اور ذاتی تجربہ کی بنا پر خاصی عمیق تھی۔ وہ محض خیالی دنیا میں پرواز کے عادی نہ تھے بلکہ زندگی کی مختلف کیفیات اور تعلقات میں شرکت کیا کرتے تھے لیکن حسبِ عادت روزمرہ کے حالات اور واقعات پر بھی ایک فلسفیانہ سی نگاہ ڈالتے اور اپنے تبصرہ میں گھر والوں کو بھی شامل کیا کرتے۔ اور پھر ان کے خیالات کا تسلسل انہیں کہیں سے کہیں پہنچا دیتا۔ لطیفوں، چٹکلوں اور اشعار وحکایات اور دلچسپ و کارآمد معلومات کا ایک بے پناہ ذخیرہ ان کے ہاں موجود تھا۔ اور وہ اپنی مخصوص ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گفتگو کرتے چلے جاتے۔ انہیں دلچسپ و سبق آموز گفتگو کرنے کا خاص سلیقہ اور ملکہ حاصل تھا۔ بڑے سے بڑے مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں پل بھر کی بھی جھجک یا ہچکچاہٹ محسوس نہ ہوتی اور ہر موضوع اور ہر زبان میں خواہ اردو ہو یا انگریزی، فارسی ہو یا پنجابی وہ ایسی دلچسپ

تقریر کرنے کہ سامعین میں سے کسی کا بھی اکتا جانا ممکن نہ تھا۔ تقریر کی یہ صلاحیت ان میں بچپن ہی سے موجود تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ انجمن حمایت اسلام کا ایک اجلاس تھا جس میں انہوں نے بے دھڑک ایک نظم اس عمر میں سنائی تھی جب کہ ان کا قد صرف اتنا تھا کہ وہ میز کی آڑ میں چھپ گئے تھے۔ لہذا ان کو میز کے اوپر کھڑا کر دیا گیا تاکہ سامعین ان کو اچھی طرح سے دیکھ سکیں۔ تقریر میں ملکہ حاصل ہونے کی ایک اور ابتدائی مثال اس زمانے کی جب کہ وہ فرسٹ ایر میں پڑھتے تھے۔ فی البدیہہ تقریر کرنے کا ایک مقابلہ ہوا جس میں ایم۔ اے تک کے طلباء نے حصہ لیا۔ حکیم صاحب ابھی فرسٹ ایر میں، علی گڑھ ایم۔ اے۔ او کالج میں داخل ہی ہوئے تھے لیکن وہ بھی اس مقابلے میں شریک ہوئے۔ اور (THE EFFECT OF SURROUNDINGS ON CHARACTER) کے موضوع پر پانچ منٹ کی تیاری سے دس منٹ کی تقریر کر کے اول انعام حاصل کیا۔ اور کالج بھر میں دھوم مچ گئی۔

مطالعہ کا شوق حکیم صاحب کو شروع ہی سے تھا۔ ابتدائی جماعتوں سے لے کر پی ایچ۔ ڈی تک تعلیم کی مختلف منازل میں ہمیشہ اپنے ساتھیوں پر نمایاں سبقت لے جایا کرتے تھے۔ اور متعدد تعلیمی اعزاز، تمغے اور آنریری ڈگریاں حاصل کرتے رہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ خدا نے غیر معمولی ذہانت بھی بخشی تھی اور فلسفہ، نفسیات اور ادبیات کی جانب ایک خاص قسم کا فطری میلان بھی تھا۔ جسے خود انہوں نے اور ان کے اساتذہ نے بہت جلد محسوس کر لیا۔ خوش قسمتی سے پیشہ بھی ایسا اختیار کیا جس میں اس طبعی دلچسپی کی افزائش کا کافی موقع ملتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے پیشے اور ان کی فطری دلچسپی میں کوئی فرق نہیں رہا تھا۔ انہیں جس وقت بھی موقع ملتا وہ کسی نہ کسی نئی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہو جاتے اور اگر کوئی دوست یا گھر والوں میں سے کوئی شخص اس موضوع کو چھیڑ دیتا تو بڑے شوق سے گفتگو جاری کر دیتے۔ وہ اکثر یہی کہا کرتے کہ جب میں کسی عالم فاضل کی کتاب کا مطالعہ کرتا ہوں تو گویا ایک غیر معمولی قسم کی صحبت میں ہوتا ہوں جو کہ ایک عام صحبت پر قابل ترجیح ہوتی ہے۔ وہ مروجہ قسم کی ملاقاتوں اور دعوتوں سے عموماً گریز کرتے تھے کیونکہ ایسی ملاقات میں عموماً سطحی قسم کی گفتگو اور معمولی ماحول ہوتا ہے لیکن اگر انہیں اپنے ہم مذاق لوگوں کی صحبت کہیں مل جاتی تو بے اندازہ خوشی حاصل ہوتی اور پھر اپنے رنگ میں آ کر محفل سجا دیتے اور روتوں کو ہنسا دیتے۔ پژمردگی کو زندہ دلی میں تبدیل کرتے اور سننے والے کے دل میں ایک نئی دنیا بسا دیتے۔ خود ان کا نظریۂ حیات کچھ ایسا تھا کہ وہ رجائی اور روشن پہلو دیکھتے تھے۔ یہ شعر اکثر پڑھا کرتے۔

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ماست

فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ماست

حکیم صاحب نے ہمیشہ اپنے آپ کو اپنی زندگی سے مطمئن پایا اور ہمیشہ خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے ان کی زندگی کی

ہر بنیادی ضرورت ہمیشہ پوری کی اور صحت، علم، عزت اور مناسب حد تک دولت بھی عطا فرمائی۔ قناعت پسندی بھی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ لہذا کبھی روپے پیسے کی خاطر یا عہدے کی خاطر انہوں نے اپنی پسندیدہ زندگی کو قربان نہ کیا۔ ایسے متعدد موقعے آئے جب کہ ان کے سامنے دونوں راستے کھلے تھے۔ لیکن انہوں نے اسی راستے کو اختیار کیا جس کے متعلق ان کا یہ خیال تھا کہ وہ ان کے لیے زیادہ موزوں ہے اور وہ اپنے جوہر کو نمایاں کر کے ملک اور قوم کی بہتر خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ اگرچہ اس فیصلہ سے انہیں مالی نقصان بھی ہوا لیکن ان کے نزدیک زندگی کی اور بہت سی قدریں مالی فائدہ کی نسبت زیادہ قابلِ قبول تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ انسان کو اپنی ضروریات سادہ اور مختصر رکھنی چاہییں تاکہ وہ اپنے آپ کو بیکار الجھاؤ میں پھنسا کر زندگی کی بلند تر قدروں کو حاصل کرنے سے محروم نہ رہ جائے اور مادی خواہشات اس کی شخصیت پر حاوی نہ ہو جائیں۔ مولانا روم کی روپیہ کے متعلق وہ مثال انہیں بہت پسند تھی جس میں کہ ایک شخص نے مولانا سے سوال کیا کہ کتنا روپیہ انسان کے پاس ہونا فائدہ مند ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ اتنا ہی جتنا کہ کشتی کے لیے پانی کا ہونا ضروری ہے۔ اگر پانی ضرورت سے کم ہو تو کشتی کا چلنا محال ہو جائے گا اور اگر مقدار سے بہت بڑھ جائے تو اس کے اندر گھسنے کا اور ڈوب جانے کا خطرہ ہے۔ سو وہی حال روپیہ کا بھی ہے یہ نہ تو اتنا کم ہو کہ بنیادی ضروریات بھی پوری نہ ہو سکیں اور نہ اتنا زیادہ ہو کہ اس کے بوجھ کے نیچے انسانی شخصیت دب کر مادہ پرست بن جائے۔ روپیہ کو تو ذریعہ یا آلہ سمجھنا چاہیئے جس کی بدولت انسان کو زندگی کی بلند پایہ قدروں کو حاصل کرنے میں مدد ملے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ جب کہ ہم سب حسبِ معمول گرما کی تعطیلات کشمیر میں گزارنے کے لیے گئے ہوئے تھے اور ان دنوں وہاں پر امر سنگھ ڈگری کالج کی پرنسپلی خالی تھی تو راجہ سر مہاراج سنگھ نے جو ان دنوں کشمیر اسٹیٹ کے وزیرِ اعظم تھے حکیم صاحب کو اس عہدے پر آنے کے لیے آمادہ کر لیا۔ گو کہ اس فیصلہ سے انہیں کئی سو روپیہ ماہوار کا مالی نقصان ہوتا تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے جدی وطن کی کشش، وہاں کے پُر فضا موسم اور کشمیری برادران کی خدمت کو ترجیح دیتے ہوئے اس عہدے کو منظور کیا اور بعد میں کشمیر میں ناظمِ تعلیمات مقرر ہوئے۔

تقسیمِ ہند کے کچھ عرصہ بعد جب ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ پاکستان کی داغ بیل پڑی تو گویا کہ انہیں اپنا من پسند کام مل گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ایک ایسا نصب العین سامنے نظر آنے لگا جو کہ نہایت قابلِ قدر بھی تھا اور ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے انتہائی موزوں بھی تھا۔ مذہب کا صحیح مفہوم واضح کرنا۔ فلسفہ اور مشرقی و مغربی علوم کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کو منطبق کرنا اور ان تمام مسائل پر غور و فکر کرنا جن کو مذہبی احکام اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق حل کرنا ضروری ہے۔ یہ مقاصد ان کے لیے قابلِ قدر نصب العین بن گئے اور وہ اپنے

ہم خیال ساتھیوں کی مدد سے ان کو حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ کاش خدا انہیں کچھ اور مہلت دیتا کہ وہ اس مفید کام کے نتائج کو اپنے سامنے مکمل ہوتے ہوئے دیکھتے جس کے لیے وہ آخر دم تک کام کرتے رہے۔ یہ ادارہ ان کو اس قدر عزیز تھا کہ جب انہیں پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلری پیش کی گئی تو انہوں نے اس کو نامنظور کر دیا محض اس خیال سے کہ جو کام وہ ادارہ میں رہتے ہوئے انجام دے رہے تھے وہ نامکمل رہ جائے گا۔

ان تمام واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اچھی طرح یہ جانتے تھے کہ وہ کس میلان اور صلاحیتوں کے انسان ہیں اور کونسا کام ان کے لیے زیادہ موزوں ہو سکتا ہے۔ گھر میں بھی وہ اپنے لیے ہمیشہ ایک گوشۂ تنہائی بنا لیا کرتے تھے جہاں وہ مقررہ اوقات میں مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے اور آرام بھی وہیں کیا کرتے تھے۔ گھر میں شور و غل اور نوکروں کے جھگڑوں سے کوسوں دور بھاگتے تھے کیونکہ ایک تو طبیعت صلح پسند تھی، دوسرے دماغی کام کے لیے سکونِ قلب نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے گھر میں سب کو اس بات کا لحاظ رکھنے کی تاکید کی جاتی تھی۔ ویسے جب بھی وہ اپنے علمی کام سے فارغ ہوتے تو گھر والوں سے اور خاص طور سے بچوں سے دلچسپ باتیں کر کے سب کا دل بہلاتے تھے۔ اپنے بچوں اور خاص کر نواسی سے اور عام طور پر سب بچوں سے انہیں بے حد لگاؤ تھا۔ وہ ان سے ہر کام پیار و محبت سے نکال لیا کرتے اور کہتے کہ زیادہ ڈانٹ ڈپٹ یا ڈر سے کام نکالنا غلط ہے۔ انہیں کچھ ڈھب بھی ایسا آتا تھا کہ زبردستی کام لینے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی تھی۔ بچوں کو بھی ان سے بے حد لگاؤ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ایک منٹ کے لیے بھی ان سے جدا نہ ہوں۔

حکیم صاحب کی زندگی کا اہم جز ان کی ظرافت و بذلہ سنجی تھی۔ حاضر جوابی کے لیے وہ اپنے احباب میں مشہور تھے اور ان ہی خواص سے ہر محفل کی جان بن جاتے تھے۔ ان کی ظرافت میں لطافت کی آمیزش بھی ہوتی تھی اور روانی بھی۔ شاعری سے بھی خاص شغف تھا اور ان کا اندازِ فکر بھی اچھوتا ہی تھا۔ زمانہ طالب علمی ہی سے شاعری میں اچھا خاصا بلند معیار انہوں نے حاصل کر لیا تھا۔ اور بعد میں بھی گاہے گاہے شاعری کی طرف توجہ کرتے رہتے تھے۔ گو کہ آخری زمانہ میں نثر ہی پر پوری طرح متوجہ رہے۔ غرض یہ کہ حکیم صاحب نے ایک قابلِ رشک زندگی گزاری اور اپنی ہمت، صلاحیت اور شوق سے وہ درجہ حاصل کیا جو کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے اور پھر ایک ایسا نظریۂ حیات اختیار کیا اور اس پر عمل پیرا بھی ہوئے جس کی مثال بہت کم پائی جاتی ہے۔ وہ سچے خدا پرست تھے۔ اور اس کے رسول صلعم سے گہری محبت و عقیدت رکھتے تھے۔ لیکن مذہب کے متعلق ان کا تصور نہایت وسیع تھا۔ اس لیے تنگ نظر اور جمود پسند عناصر سے اختلاف کرتے تھے۔ مذہب کے معاملے میں وہ بڑے روادار تھے۔ کسی عقیدے

کو زبردستی منوانے کے قائل نہ تھے۔ اسلام کے جو اصول دوسرے مذاہب میں بھی پائے جاتے ان کو غیر مسلموں پر واضح کر کے انہیں یہ ترغیب دیتے تھے۔ کہ ان کے اپنے مذہب اور اسلام میں جو تعلیمات مشترک ہیں ان کا غائر مطالعہ کریں اور صلح پسندی سے کام لیں۔

عورتوں کو اسلام نے بہت حقوق دیئے ہیں اور حکیم صاحب یہ چاہتے تھے مسلمان ان حقوق کا احترام کریں عورتوں کو ان کے جائز حقوق دینے اور سماج اور رواج کی بندشوں سے آزادی دلانے کی مہم میں حکیم صاحب نے نمایاں حصہ لیا۔ ان کی کوششوں کا ایک مفید نتیجہ عائلی کمیشن کی رپورٹ کی شکل میں نکلا۔ آج اگر وہ زندہ ہوتے تو یہ دیکھ کر کس قدر خوش ہوتے کہ انہی سفارشات کی بنیاد پر پاکستانی عورتوں کے حقوق کا منشور مرتب کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر نگینہ کاظمی

پاکستان کا ایک عظیم ترین فرزند

یہ عجیب حسن اتفاق تھا کہ اپریل ۱۹۵۲ء کے تیسرے ہفتے بین بین الاقوامی اپوا کانفرنس سے واپسی پر میں ایرانی مجلس خواتین کے ایک اجلاس میں پاکستان سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کر رہی تھی، کانفرنس ہال حاضرین سے پُر تھا لیکن اس میں پاکستانی سفارت کا ایک نمائندہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس اجلاس میں کسی پاکستانی کا سرے سے موجود نہ ہونا میرے لیے ذہنی تشویش کا موجب تھا اور وہ اس لیے کہ میری تقریر کے سلسلے میں جو اہتمام کیا گیا تھا اس میں خصوصیت کے ساتھ پاکستان کے پریس اتاشی ڈاکٹر عرفانی کے عملی تعاون کو دخل تھا اور ایرانی مجلس خواتین کے اجلاس میں پاکستان سے متعلق ایک ایرانی کی یہ پہلی تقریر تھی۔

تقریر ابھی اپنی ابتدائی منزل میں تھی اور میں پاکستان کی عام صورت حال کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس اثنا میں سامنے کے دروازے سے ڈاکٹر عرفانی ہال میں داخل ہوئے اور میرا سلسلۂ کلام منقطع ہو گیا۔ ان کی معیت میں ایک معمر شخص تھا جس کے تر و تازہ چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اس کے بشرے پر وقار ٹپک رہا تھا اور اس کی شخصیت کچھ ایسی اثر آفریں تھی کہ ایرانی اس کی تعظیم اور پیشوائی کے لیے سرو قد کھڑے ہو گئے اور اس کے لیے ایک نشست خالی کی۔ پاکستانی مہمانوں کی آمد سے قبل میں نے اپنی تقریر میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا مختصر الفاظ میں ان کا لب لباب پیش کیا اور قریب قریب ایک گھنٹے تک سادہ اور بے تکلف انداز میں اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھا۔

تقریر کے بعد مجھے پاکستان کے مقتدر مہمان اور عظیم پاکستانی مفکر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم سے متعارف کرایا گیا۔ موصوف ریاست ہائے متحدہ اور بعض دیگر ممالک کے تقریری دورہ کے بعد اپنے وطن کی جانب مراجعت فرما رہے تھے۔ پاکستان کی اس لافانی شخصیت سے میری ملاقات کا یہ پہلا اتفاق تھا اور عمر بھر مجھے اس شرف پر ناز رہے گا کہ موصوف ایسی لائق و فائق ہستی نے میری معروضات کی سماعت فرمائی۔ اس فاضل اجل اور بیدار مغز مفکر نے پورے ۶۰ منٹ تک مجھ ایسی حقیر و عاجز مقررہ کی غیر مربوط تقریر بڑی خندہ پیشانی اور حوصلہ افزا تبسم کے ساتھ سنی۔ ڈاکٹر خلیفہ میری تقریر سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے تھے

حالانکہ یہ تقریر ان چند امور سے متعلق ایک سیدھا سادھا سا بیان تھا جن کا پاکستان میں میں نے بچشم خود مشاہدہ کیا تھا میں نے اس تقریر میں نہ پرشکوہ الفاظ کا سہارا لیا تھا اور نہ فصاحت و بلاغت کے موتی بکھیرے تھے۔ موصوف نے بار بار میرا شکریہ ادا کیا اور ان الفاظ میں خراج تحسین بھی ادا فرمایا:۔

"آپ نے سرزمین ایران کے باشندوں کے دل و دماغ میں خیر اندیشی و خیر سگالی کے جذبات بیدار کر دیے ہیں۔ آپ کی پرخلوص اور بے لوث دیانت سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں"

موصوف مسکرائے ہنسے اور ایسے انداز میں بات چیت کی جس سے روحانی حرارت ٹپکی پڑتی تھی۔ کسی موضوع کی رعایت کے بغیر موصوف کی گفت گو سے ادبی اور روحانی ذوق کی تسکین ہوتی تھی۔ اس اجلاس میں پاکستانیوں کی عدم شمولیت کے باعث مجھے جو ذہنی تشویش ہوئی تھی اس کا احساس بالکل جاتا رہا۔ پاکستان کے ایک عظیم ترین فرزند اور علامہ اقبال کے ذاتی دوست سے میری ملاقات نے نیز پاکستان کا تعارف کرانے میں میری نیازمندانہ مساعی کی قدر افزائی موصوف نے جن پرخلوص احساسات کے ساتھ کی تھی ان سے میرے تاثرنے اس کمی کا کافی سے زیادہ تدارک کر دیا اور مجھے یہ موقع دیا کہ میں اس ہمسایہ ملک سے متعلق بلند تر تصورات کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دوں۔ میں حسب منشا ڈاکٹر خلیفہ سے رابطۂ کلام کے مواقع حاصل نہیں کر سکی اور وہ اس لیے کہ موصوف کا قیام ڈاکٹر عرفانی کے پاس تھا اور وہ ایران کے ممتاز علما و فضلا سے موصوف کی ملاقاتیں کرا رہے تھے کبھی موصوف کو اپنے ہمراہ لے جاتے اور کبھی ملاقات کے لیے ایرانی فضلا کو مدعو کرتے۔ میری انتہائی خواہش تھی کہ میں موصوف کو اپنے غریب خانہ پر مدعو کرنے کی سعادت حاصل کروں لیکن عرفانی کچھ اس بلا کی عجلت میں تھے کہ بات بنتی نظر نہیں آتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ خدا نے یہ موقع مرحمت فرمایا ہے کہ ڈاکٹر خلیفہ کے توسط سے پاکستان اور ایران کے درمیان ادبی روابط مستحکم ہوں موصوف کی تقریریں، خطابات اور رسمی گفت گو بھی دل نواز، سبق آموز اور اثر آفریں ہوتی تھی۔

ڈاکٹر خلیفہ ایران سے رخصت ہوئے لیکن جو خوش گوار و خوش کن یادیں وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے باقی رہ گئیں اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا پاکستان سے میرا ذہنی علاقہ اور قلبی رابطہ بڑھتا گیا۔ چونکہ میں بڑی حد تک ادبی مذاق کی حامل اس لیے میں نے اپنے یہاں کے ہر دل عزیز انشا پرداز سینیٹر و رکن مجلس مقننہ ( ) حجازی سے درخواست کی کہ وہ ایران پاکستان کلچرل ایسوسی ایشن (پاک ایران ثقافتی انجمن) کا افتتاح کریں۔ انھوں نے میری تجویز سے اتفاق کیا اور میاں نسیم حسین اور ڈاکٹر عرفانی (جن کا نام اس ملک میں ہر شخص کی زبان پر چڑھا ہوا ہے) کے تعاون سے اس انجمن نے اپنا کام چالو کر دیا۔ اس انجمن کے جلسوں اور ثقافتی تقریبات کے لیے میں نے اپنے غریب خانہ کی پیش کش کی اور ہم نے ۱۹۵۵ء کے اوائل تک اپنی یہ ناچیز سرگرمیاں جاری رکھیں یہ سال وہ ہے کہ ڈاکٹر عرفانی نے جو ان تمام عملی

سرگرمیوں کی قوت متحرکہ تھے ایران کو خیرباد کہا لیکن خوش قسمتی سے اس اثنا میں دونوں ممالک کے مابین سرکاری طور پر دوستانہ تعلقات کی پینگیں بڑھ چکی تھیں اور ایران و پاکستان زندگی کے مختلف شعبوں میں شانے سے شانہ ملا کر چل رہے تھے۔

ایک مرتبہ اور مجھے ایک عجیب قسم کی ذہنی تشویش لاحق ہوئی اور یہ اس وقت جبکہ ڈاکٹر خلیفہ کا ایک مکتوب ملا جس میں مجھے اس غرض سے لاہور آنے کی دعوت دی گئی تھی کہ میں خصوصیت کے ساتھ خواتین کے حلقوں میں ایران کے ساتھ ثقافتی روابط کو فروغ دوں۔ میں نے اپنے دورہ کے پروگرام کا جائزہ لیے بغیر اس دعوت پر لبیک کہا۔ میرے لیے یہ شرف کیا کم تھا کہ خلیفہ صاحب نے مجھے مدعو کیا تھا اور یہ وہ ہستی تھی جس کی میری نظر میں بڑی قدر و منزلت تھی اور اس کے ملک سے بھی مجھے قلبی لگاؤ تھا۔

فروری ۱۹۵۷ء کے وسط میں، میں لاہور پہنچی، ڈاکٹر خلیفہ نے اپنے چند احباب کی معیت میں لاہور ریلوے اسٹیشن پر ذاتی حیثیت سے میرا خیر مقدم کیا۔ میری زندگی میں یہ ایک حد درجہ سبق آموز موقع تھا۔ ڈاکٹر اور بیگم خلیفہ نے مجھے اپنے کنبے کے ایک فرد کی حیثیت سے اپنے یہاں ٹھہرایا۔ اس معزز و محترم جوڑے نے جس مشفقانہ التفات اور جس دوستانہ گرم جوشی سے میری خاطر مدارات کی اس نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا، مجھے کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا تھا کہ مجھ پر خواب و بیداری کی ملی کیفیت طاری ہے اور میں سوچتی تھی کہ:

این کہ می بینم بہ بیداری ست یارب یا بخواب

ڈاکٹر خلیفہ مجھے بنفس نفیس ہر جگہ ساتھ لیے لیے پھرتے تھے اور اس سے مجھ پر فرحت و انبساط کی ایسی کیفیت طاری ہوتی تھی کہ پہلے کبھی اس کی ہلکی سی پرچھائیں بھی مجھ پر نہیں پڑی تھی۔

گرد و پیش کی ہر شے سے متعلق موصوف کے حکمت آمیز فقرے اور وہ اشعار جو موقع و محل کی مناسبت سے یا ایجاز و اختصار کی غرض سے آپ کبھی کبھی پڑھتے تھے میرے لیے سبق آموز بھی تھے اور دلچسپ بھی۔ آپ قریب قریب ہر موضوع پر اظہار خیال فرماتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ میری ذہنی سطح اور میرے علمی پس منظر کا لحاظ بھی رکھتے تھے۔

ایک دن میں نے موصوف سے اپنے دل کی بات کہہ دی کہ آپ ایسے فاضل اجل، مذہب اور فلسفۂ مذہب کے ترجمان کی موجودگی میں مجھے اپنی کم مائگی اور بے بضاعتی پر خفت سی محسوس ہوتی ہے۔ پدرانہ شفقت اور ہلکے سے تبسم کے ساتھ آپ نے میری بات کاٹتے ہوئے فرمایا:

"لوگوں کا اسلام صرف زبانی اقرار تک ہے اور تمہاری زندگی اس کی تصدیق کر رہی ہے کہ تم مسلمان ہو۔"

یہ ایک عظیم ترین خراج تحسین تھا جو مجھ ایسی عورت کو جسے اہم مسائل درپیش ہیں ایسی ممتاز شخصیت نے ادا

کیا جو بزرگ ترین اسلامی مملکت سے اسلامی ثقافتی مرکز کی قیادت سنبھالے ہوئے تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ضمنی طور پر مجھ پر یہ حقیقت بھی آشکارا ہوئی کہ موصوف کی نظر کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ مذہب اور زندگی کے بارے میں موصوف کا حقیقت پسندانہ زاویۂ نگاہ محدود نہ تھا۔ آپ کے نزدیک بہترین اور اعلیٰ زندگی روحانی تربیت کا نتیجہ ہے۔ موصوف کے خیال میں مذہب چند تحریری قوانین اور چند عبادات پر منتہی نہیں ہوتا۔ یہ چیزیں تو بالکل ابتدا کی ہیں۔ مجھے موصوف کی معیت میں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ روحانی، جذباتی اور ذہنی طور پر میرے تصورات ان کے تصورات سے ہم آہنگ ہوگئے ہیں۔ موصوف کی مشفقانہ عنایت اور پدرانہ شفقت ہی تھی جس نے مجھے سنبھالا اور میرے اندر خود اعتمادی کی روح پھونکی۔ موصوف کی بدولت میرا یہ پختہ عقیدہ ہوگیا کہ انسان کی زندگی اتنی زیادہ المناک اور حرماں نصیب نہیں ہے جتنا کہ شعرا، مفکرین اور صوفیہ نے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر کوئی اپنا زاویۂ نظر بلند کر سکے تو اس سے زیادہ فرحت و انبساط کی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ میں نے بھی دوسروں کی طرح لوگوں کو اولیاءاللہ اور ان کے خوارق عادات کا تذکرہ کرتے سنا ہے لیکن ان کا تعلق ماضی بعید سے ہوتا ہے یا مرحومین اور ان کے واقعات سے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے ایک زندہ ولی کی زیارت کی ہے، ایسے ولی کی زیارت جو ایک عام انسان کی طرح اپنی زندگی بسر کرتا اور اسی فضا میں سانس لیتا ہے۔ یہ ولی ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم تھے ایک عظیم فلسفی، ایک فاضل اجل، ذہین و فطین عالم۔ آپ اتنی عظیم الشان شخصیت کے حامل تھے کہ آپ نے اپنے تبحر علمی کی بدولت یہ جان لیا تھا کہ زندگی کی حقیقی قدریں موشگاف یا جوہر پاش فلسفے سے متعین نہیں ہو سکتیں بلکہ ان کا تعین ایک سادہ اور ابتدائی پیمانہ، قلب انسانی سے ہو سکتا ہے۔

موصوف کی رحلت پاکستان اور ایران کے لیے ایک عظیم قومی نقصان ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو موصوف سے راہ و رسم رکھتے تھے یہ ایک ذاتی نقصان بھی ہے۔ مجھے بھی مرحوم سے ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے۔ یہ نقصان عظیم بھی ہے اور الم ناک بھی لیکن اس کے ساتھ ہی اس نقصان نے یہ حقیقت آشکارا کر دی ہے کہ ایسی اخوت انسانی سے تعلق بہت بڑا اعزاز ہے جو خلیفہ عبدالحکیم ایسے انسانوں کو جنم دیتی ہے۔

بیگم رضیعہ حسن

اپنے والد کی یاد میں

اولاد اور والدین کے درمیان محبت کا تعلق ہونا انسانی فطرت کا ایک اہم تقاضا ہے لیکن میرا اپنے والد سے جو قلبی تعلق تھا اس میں خود ان کی غیر معمولی شخصیت کی وجہ سے چند ایسی خصوصیات بھی پیدا ہو گئی تھیں جن کی وجہ سے یہ رشتہ بھی کچھ عام رشتوں سے مختلف ہو گیا تھا۔ وہ نہ صرف میرے والد تھے بلکہ ایک مخلص دوست و رہبر اور ہر قسم کے معاملات میں، چاہے وہ دنیوی ہوں یا دینی یا علمی وہ ایک بلند پایہ مشیر بھی تھے۔ ان کی شخصیت میں جو صفات تھیں وہ محض گھر والوں ہی کے لیے نہ تھیں بلکہ زندگی میں جس شخص سے بھی ان کا کم و بیش تعلق رہا ہے وہ اس بات کی گواہی دے سکتا ہے کہ اس نے ان میں ان خوبیوں کو کس حد تک پایا ہے۔ اہل خانہ کو البتہ اسے اپنی خوش قسمتی جاننا چاہیئے کہ انہیں ان کی صحبت و شفقت سے مستفید ہونے کا سب سے زیادہ موقع ملا۔ میں خدا تعالےٰ کی از حد شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے ایسے قابل فخر باپ کی بیٹی بنایا۔

بچپن ہی سے جب سے میں نے ہوش سنبھالا میں نے انہیں اپنے ساتھ وقت کا بیشتر حصہ گذارتے ہوئے دیکھا ان کی طبیعت میں انتہائی نرمی اور صلح پسندی تھی۔ اور مجھے اپنے ہوش میں کوئی ایسا واقعہ نہیں یاد ہے کہ انہوں نے بچپن میں وانٹ ڈپٹ یا مارپیٹ سے کوئی کام لیا ہو۔ جس طرح دوسرے تمام معاملات میں ان کا طرز عمل عقلمندانہ تھا اسی طرح بچوں کے ساتھ بھی ان کا برتاؤ نفسیاتی تھا وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر خدا نے مجھے ماں بنایا ہوتا تو میں ہر کام بچوں سے بغیر رلائے لے لیتا۔ انہیں ہمیشہ سے بچوں سے خاص لگاؤ تھا اور کہا جاتا ہے کہ یہ بھی انسان کے نیک ہونے کی نشانی ہے کہ کسی شخص کو بچوں سے اور بچوں کو اس سے لگاؤ ہو۔ نتیجہ یہ تھا کہ جو کام دوسرے لوگ بصد مشکل بچہ سے کرواتے اسے وہ محض ایک گر کی بات کر کے بچہ سے بخوشی کروا لیتے۔ اور یہی حال ان کا دوسرے اشخاص سے تعلقات میں بھی تھا۔ اگر خاندان میں یا دوست احباب کے ہاں کوئی ایسا کٹھن مسئلہ پیش آجاتا جسے وہ نہ سلجھا سکتے تو وہ دوڑے ہوئے ابا جان کے پاس آتے تھے اور وہ اسے اپنی صلح جوئی، صائب رائے اور معقول دلائل سے نہایت خوش اسلوبی سے طے کرا دیتے۔ جو بات بعض ٹیڑھے اشخاص کسی صورت میں بھی ماننے کو تیار نہ ہوتے تھے وہ بھی ان کے کہے سے مان جاتے۔ دراصل وہ جس کسی سے

بھی ملتے اسے یہ یقین ہو جاتا کہ وہ اس سے سچی ہمدردی رکھتے ہیں۔ اور ایک مرتبہ جب کسی کو ان کے خلوص اور ہمدردی کا یقین ہو جاتا تو پھر چاہے اس کو وہ کڑوی سے کڑوی یا سخت سے سخت بات ہی کیوں نہ کہتے وہ ہرگز بُرا نہ مانتا۔ ان کے بعض ملنے والے عموماً اس بات پر حیران ہوا کرتے تھے کہ خلیفہ صاحب لوگوں کو بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اور کوئی برا نہیں مانتا۔ لیکن اگر ہم وہی بات کسی سے کہہ بیٹھتے ہیں تو لوگ بگڑ جاتے اور ہماری بات تک سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے!

اباجان کا قول تھا کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچوں کی تربیت اچھی ہو اور وہ کسی قابل بنیں، آپ سے متاثر ہوں اور اچھی باتیں آپ سے سیکھیں تو لازمی طور پر آپ کو ان کے لیے وقت دینا پڑے گا۔ وہ آجکل کی نئی روش کے بعض والدین کے رجحان کے خلاف تھے کہ وہ اپنے معاملات اور سوشل زندگی میں اس قدر محو رہیں کہ بچوں کے لیے ان کے پاس کوئی وقت ہی نہ ہو کہ وہ ان سے کوئی کام کی بات سیکھیں یا اپنی دن بدن بڑھنے اور نئے سانچوں میں ڈھلنے والی شخصیت کی نشوونما میں والدین کے تجربہ اور شفقت سے مستفید ہو سکیں۔ آیندہ قوم کی ترقی کے ضامن یہی آجکل کے بچے ہیں اور اگر ان ہی کی پرورش پر وقت اور محنت نہ صرف کی جائے تو پھر ان کے مستقبل سے کیا امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں؛ چنانچہ ان کا عمل بھی ان کے قول کے مطابق ہی تھا اور انہوں نے ہماری تعلیم و تربیت کچھ اس انداز سے کی کہ ہمیں کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ ہماری اصلاح کے لیے خاص طور سے کوئی وعظ و تلقین کی جا رہی ہے یا ہم کو زبردستی بٹھا کر کوئی خشک تعلیمی درس گھول کے پلایا جا رہا ہے۔ انگریزی میں ایک مقولہ ہے کہ MEN SHOULD BE TAUGHT AS IF THEY WERE TAUGHT NOT. چنانچہ ان کا طریق تعلیم بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ قدم قدم پر اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے یا خود کوئی اچھی کتاب پڑھتے لکھتے ہوئے ہمیں بلا کر کسی کی کہی ہوئی یا اپنی مفید اور سبق آموز باتیں بتایا کرتے اور پھر اسی ضمن میں ایک سے ایک اچھے اشعار سناتے اور اردو، انگریزی، پنجابی، فارسی، عربی، جرمن اور فرانسیسی زبان کے عمدہ مقولے بیان کیا کرتے۔ اپنی بات کو اس قدر دلچسپ اور دل نشیں انداز میں کہتے کہ سننے والے کے دل میں اتر جاتی اور اس طرح ذہن نشین ہوتی کہ عرصہ تک نہ بھولتی۔ سردیوں کے زمانے میں ہم سب آتشدان میں آگ جلا کر اس کے گرد بیٹھ جاتے تھے اور اباجان کوئی نہ کوئی نئی کتاب لیے ہوئے اس میں سے دلچسپ باتیں اور اشعار ہمیں سنا کر ان پر ہمارے ساتھ ساتھ اپنا خیال بھی ظاہر کیا کرتے اور پھر بات میں سے بات نکلتی ہوئی کبھی شاعرانہ کبھی فلسفیانہ کبھی سیاسی اور کبھی مزاحیہ گفت گو کا رنگ اختیار کر لیتی۔ اور گھنٹے منٹوں میں گذر جاتے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس فضا میں جو تعلیم میں نے ایک حد تک غیر ارادی طور پر اور بے کوشش کے حاصل

کی اس سے مجھے اپنی زندگی میں بے حد فائدہ ہوا ۔ مجھے اس سے نہ صرف اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں پیش پیش رہنے میں مدد ملی بلکہ علم کا ذوق اور مطالعہ کا شوق بھی پیدا ہو گیا ۔ انہیں اس بات کی خوشی تھی کہ ان کی مختصر سی اولاد یعنی ایک لڑکا اور ایک لڑکی میں سے اگر لڑکے کو سائنس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کم از کم لڑکی نے ان کے مضمون فلسفہ اور پھر نفسیات کی طرف اپنے رجحان کا اظہار کیا، ان مضامین کی تعلیم پائی اور ردی اور ان کی روایت کو قائم رکھا۔

نہ صرف کتابی تعلیم بلکہ زندگی کے متعلق صحیح اور کارآمد نظریات قائم کرنے میں ابا جان کی زندگی خود ایک زندہ مثال تھی ۔ ان کا نظریہ حیات صحیح معنی میں فلسفیانہ تھا وہ بڑے سے بڑے دنیوی یا مالی نقصان کو اپنے نزدیک حقیر جانتے تھے ۔ اور کہتے تھے کہ اصل چیز جو انسان کے پاس ہونی چاہیئے وہ خدا پر ایمان اور علم و ہنر ہے اور اگر یہ چیز حاصل ہے تو پھر اس کے مقابلے میں اور اس کے علاوہ چیزیں ہیچ ہیں ۔ قلبی و روحانی سکون سے بڑھ کر ان کے نزدیک کوئی چیز نہ تھی ۔ ان کی زندگی میں بارہا ایسے مواقع آئے کہ انہیں ایک طرف مالی اور دنیوی فائدہ حاصل کرنے کا اختیار دیا گیا اور دوسری طرف اپنا من پسند علمی شوق پورا کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے ہر بار اپنے علمی شوق کو ترجیح دی ۔ انہیں خدا نے جو نعمتیں اور ہنر عطا کیا تھا انہیں ان کا احساس تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ جس دائرہ میں خدا نے انہیں برتری عطا کی ہے ان کا فرض ہے کہ وہ اسی شعبہ میں رہتے ہوئے ملک و قوم اور نوع انسانی کی خدمت کریں ۔ اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ادارہ ثقافت اسلامیہ قائم کیا اور اسلام کے دائمی اصولوں کو موجودہ زمانہ کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے قابل عمل طور پر پیش کرنے کا بیڑا اپنے سر لیا اور اس کام کو اپنی زندگی کا ایک اہم مقصد قرار دے کر اپنا تن من دھن اسی مقصد کے حصول میں لگا دیا ۔ یہاں تک کہ وہ آخر دم تک اس ادارے کی ترقی کے لیے کام کرتے رہے ۔ افسوس کہ قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ انہیں اس زندگی کے چند سال اور مل جاتے اور قوم کو ان کے گراں قدر خیالات سے مستفید ہونے کا مزید موقع حاصل ہوتا ۔ ابا جان کے انتقال سے چند ہی دن قبل میں نے دیوان حافظ سے ایک فال نکال کر دیکھا، جو کہ ان کے تمام ارادوں کو محض ابتدائی شکل تک ہی پہنچ پانے کی طرف اشارہ کرتا تھا :

زمانہ از ورق گل مثال روئے تو بست
ولی ز شرم تو در غنچہ کرد پنہانش

اس کے بعد ہی میں نے متفکر ہو کر دوبارہ فال دیکھی جس سے صاف الفاظ میں ان کی وفات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے : ۔

بر سر تربت ما چوں گذری ہمت خواہ　　　که زیارت گہ رندان جہاں خواہد بود

بر زمینی کہ نشانِ کفِ پائے تو بود　　　سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

دیوان حافظ سے فال اباجان بھی اکثر نکالا کرتے یعنی جب کبھی بھی طبیعت کسی مسئلہ کی وجہ سے مضمحل ہوتی تو لسان الغیب حافظؒ سے اس معاملہ پر رائے طلب کرتے اور ان کا تجربہ یہ تھا کہ انہیں ہمیشہ برمحل اور صحیح جواب ملا کرتا۔ اس کے بعد خود میں نے بھی بارہا اس کا تجربہ کیا اور یہی دیکھا کہ جیسے بھی حالات پر سوال کیا جائے اس کے مطابق ہی نہایت برمحل اور پتے کا جواب ملتا ہے۔ یہ کیونکر ہوتا ہے اور کن اصولوں کے تحت یہ ممکن ہوتا ہے اس کا جواب میرے لیے آسان نہیں۔ لیکن میرا تجربہ یہی ہے۔

جہاں تک انسانیت کا تعلق ہے وہ اباجان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ خندہ پیشانی سے ہر ایک سے ملنا اور ہر کہ ومہ سے یکساں درجہ پر ملنا ان کی فطرت میں داخل تھا۔ خلوص اس قدر تھا کہ رسمی طور پر بڑے سے بڑے افسر یا حاکم تک سے ملنے کے قائل نہ تھے لیکن ان کے علم وفضل کی بنا پر ہر شخص ان سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کا خواہشمند رہتا اور وہ بخوشی مختلف موضوعات پر اس سے گفت گو کرتے رہتے اور عموماً ہر شخص کو اس قدر متاثر کرتے کہ وہ گرویدہ بن کر رہ جاتا۔ جادو بیانی و محفل آرائی، ظرافت و بذلہ سنجی ان جیسے عالم شخص میں ہونا سونے پر سہاگے کا کام دیتی تھی۔ وہ جس محفل میں بیٹھتے وہاں تمام حاضرین قدرتی طور پر ان ہی کی طرف متوجہ رہتے اور ان کی دلچسپ اور سبق آموز باتوں سے محظوظ ہوتے۔

انصاف پسندی بھی اباجان کی طبیعت میں خاص طور سے نمایاں تھی وہ ہمیشہ حق بات کا ساتھ دیتے اس چیز کا خیال کیے بغیر کہ آیا وہ کسی ادنیٰ ملازم کی زیادتی پیش ہو رہی ہے یا کسی عزیز یا دوست کے خلاف پڑ رہی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ نہ صرف گھریلو بلکہ بیرونی معاملات میں بھی انہیں ثالث مقرر کیا جاتا تھا۔

آخری لمحہ تک ان کی زندگی اپنے نصب العین کی جستجو سے خالی نہ تھی۔ میرے خیال میں ان کی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا لمحہ گزرا ہو جس میں کہ انہوں نے اپنے آپ کو اکتایا ہوا محسوس کیا ہو۔ اور اس کا راز یہی تھا کہ بیشتر اوقات وہ بہترین مفکرین کی صحبت میں اپنے آپ کو مطالعہ کے ذریعہ پہنچا دیا کرتے یا کسی نہ کسی موضوع پر اپنے خیالات کو سپرد قلم کیا کرتے اور یا پھر اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب کی صحبت میں وقت گزارتے اور ان سے تبادلہ خیالات کرتے۔ پہاڑوں کی خاموش فضا میں وہ اپنے آپ کو مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں محو رکھتے۔ موسم گرما میں ہر سال کم از کم تین چار ماہ کے لیے پہاڑ پر ضرور جاتے اور اس دوران میں ایک نہ ایک بیش بہا کتاب کی تصنیف مکمل کر لیتے۔ اردو اور انگریزی میں اظہار خیالات کی انہیں یکساں قدرت حاصل تھی۔ بات بات

پردہ جو بات بھی کہتے وہ انمول ہوتی اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے جاننے والوں کو ان کی جس قدر دلچسپ باتیں یاد ہیں وہ سب اگر جمع کی جائیں تو یقیناً ایک دلچسپ کتاب بن سکتی ہے

ابا جان کو اپنے دین سے جو محبت تھی اس کے بارے میں میں چند الفاظ کہے بغیر نہیں رہ سکتی۔ انہوں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا اور اسے زندگی کے ہر شعبہ کی کسوٹی پر پرکھ کر پورا پایا۔ چونکہ انہیں اس بات کا یقین محکم تھا کہ یہی مذہب ہے جو کہ قوانین قدرت کے مطابق ہے اور اس لحاظ سے اس کے بنیادی اصول دائمی ہیں گو تفاوت روزگار اور ملک ملک کی تہذیب و تمدن کے اختلاف کی وجہ سے ان اصولوں کا طریق اظہار بالکل یکساں ہونا ممکن نہیں۔ وہ جس طرف بھی نگاہ اٹھاتے انہیں وحدت خدا کا ثبوت نظر آتا۔ ان کا نظریہ حیات اساسی طور پہ مذہبی تھا اور ان کے اعمال بھی ان کے فرقی عقائد پر مبنی تھے۔ اس لیے ان کی زندگی میں پوری ہم آہنگی پائی جاتی تھی اور ایک سچے مسلمان کا سکون قلب حاصل تھا۔ یہاں تک کہ مرنے کے بعد بھی ایک مسکراہٹ ان کے چہرے پر موجود تھی اور اسے دیکھ کر ایک عجیب قسم کا صبر و سکون دیکھنے والے پر طاری ہو جاتا تھا۔

سکھ مسلم تاریخ

مصنفہ ابوالامان امرتسری

سکھ تاریخ میں مسلمان بادشاہوں اور حکمرانوں کو سراپا غلط اور بے بنیاد الزام لگا کر بدنام کیا گیا ہے۔ اور بعض مورخین نے تہذیب اور اخلاق کی تمام ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو کر مسلمانوں کی تحقیر کی ہے۔ چونکہ وہ تاریخ ایک ایسی زبان میں تھی جس سے مسلمان عام طور پر آشنا نہ تھے اس لیے وہ اس تاریخ کا صحیح رنگ میں جائزہ نہ لے سکے اور نہ ہی اس کا ازالہ کر سکے۔ اور اسی وجہ سے یہ زہر اندر ہی اندر اپنا کام کرتا رہا۔

ابوالامان امرتسری نے ان الزاموں کو سکھ تاریخ اور حقائق کی روشنی میں بے بنیاد ثابت کر کے واضح کیا ہے کہ یہ بہت عرصہ بعد مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ قیمت ۲ روپے ۸ آنے

ملنے کا پتہ: سیکریٹری ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور

بیگم جہاں آرا شاہنواز

خلیفہ صاحب

خلیفہ عبدالحکیم صاحب سے میرا تعارف اس وقت ہوا جب مرحوم والد صاحب (سر محمد شفیع) والسرائے کی اگزکٹو کونسل میں وزیر تعلیم تھے۔ پردہ سے باہر آنے کی ابتدا ہوئی تھی اور ہم والد صاحب کے صرف چند احباب سے ملے تھے۔ خلیفہ صاحب کی نئی شادی ہوئی تھی اور وہ اپنی دلہن خدیجہ بیگم کو لے کر آئے تھے۔ ان کا قیام نارادیری میں تھا اور وہاں سے صرف ایک دن کے لیے شملہ آئے تھے۔ دونوں والد صاحب سے ملے۔ وہ ان کو اوپر لے آئے اور ہم سب سے تعارف کرایا۔ ہم سیسل ہوٹل سے اوپر کی پہاڑی پر کوٹھی انور آدم میں رہتے تھے۔

خلیفہ صاحب کے گھرانے سے برسوں کے خاندانی مراسم تھے اور خدیجہ بیگم کے والد عبدالغنی سیشن جج سے والد صاحب کے برادرانہ مراسم تھے۔ اور خدیجہ بیگم ہمارے والدین کے لیے بطور بھتیجی کے تھیں۔ ان کی تعلیم کوئین میری کالج میں ہوئی تھی اور اکثر ملنا ہوتا تھا۔ ہم سب کو خصوصاً والد صاحب کو یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ دونوں بفضل خدا بہت مناسب اور موزوں جوڑی ہیں۔ ہم سب نے زور دے کر ان کو ایک رات وہیں ٹھیرا لیا۔ رات کے کھانے کے بعد شعر و شاعری شروع ہوئی۔ ایک طرف خلیفہ عبدالحکیم اور دوسری طرف بھائی بشیر احمد، غرض ایک بجے رات تک ایسی محفل آراستہ رہی کہ سونے کو کسی کا دل نہ چاہتا تھا۔ جس وقت خلیفہ صاحب نے "چل میرے چرخے چرخ چوں" سنایا ہے تو ہم سب بے حد محظوظ ہوئے اور مرحوم والد صاحب نے اصرار کر کے دوبارہ یہ نظم سنی۔ ان دنوں چرخے کا دور دورہ تھا اور عبدالحکیم صاحب نے یہ نظم نئی نئی لکھی تھی۔ اس کے بعد بارہا ملنا ہوتا رہا۔ اور ہم ان دونوں کے آنے کے منتظر رہتے تھے۔

حیدر آباد دکن سے واپس آنے کے بعد تو ہمارے گھرانوں میں ایسی کم محفلیں منعقد ہوئی ہوں گی جن میں خلیفہ عبدالحکیم موجود نہ ہوں۔ جب سمندر پار کے رہنے والے اور اسلامی ممالک کی نامور ہستیاں زیب محفل ہوں تو خلیفہ صاحب کا شریک نہ ہو سکنا باعثِ صد افسوس ہوتا اور مجلس سونی ہو جاتی تھی۔ ان کی غیر معمولی شخصیت جس میں قابلیت، جاذبیت، ملنساری، بذلہ سنجی، نکتہ رسی اور خلوص و ہمدردی جیسے اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے، بڑی دلکش تھی۔ اسلام کا انھوں نے بہت غائر مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ اسلام کے صحیح احکام کو دور حاضرہ کی روشنی میں دیکھنا اور تقاضوں کو ان سے ہم آہنگ کرنا انہیں کا کام تھا۔ سامعین ان کی فہم و فراست کا گہرا نقش لیے ایسی محفل سے اٹھتے

نہ تھے۔ فلسفی اور بھی تھے۔ انشاپردازوں کی کمی بھی نہ تھی۔ اقبالیات سے شغف رکھنے والے بھی کافی تھے۔ مثنوی کی ترجمانی بھی بڑی قابلیت کے ساتھ کئی لوگ کر چکے تھے۔ بیشک ان چیزوں میں خلیفہ صاحب درجۂ اختصاص پر فائز تھے لیکن منفرد نہ تھے۔ جس بات میں ان کو میں نے منفرد پایا وہ تھا ان کا مقام انسانیت۔

ہم لوگوں میں وہ اس طرح گھل مل کر بیٹھتے کہ کسی طرح کا امتیاز و تفوق اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔ پندار اور نخوت کا مظاہرہ اگر کرنا بھی چاہتے تو نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بات ان کی فطرت سے بعید تھی۔ سب سے بڑی خوبی ان میں یہ تھی کہ اپنی کہتے تھے اور کہتے رہتے تھے لیکن دوسرے کی بھی سنتے تھے اور اگر بات سمجھ میں آجاتی تو مان بھی لیتے تھے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے، ادارہ کے لان پر کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ سردی کا موسم تھا۔ دھوپ میں مجلس جمی اور باتیں شروع ہوگئیں۔ مختلف مسائل زیر بحث آئے۔ کچھ سوچتے ہوئے خلیفہ صاحب نے کہا:

"شراب کی حرمت کا سبب یہ ہے کہ اس سے نشہ پیدا ہوتا ہے، آدمی بہک جاتا ہے۔ ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے، لیکن اگر شراب اتنی پی جائے کہ نشہ نہ ہو تب تو شراب حرام نہیں ہونی چاہیئے۔" انہوں نے چاہا اس پر تحقیق کی جائے۔ چنانچہ معلوم ہوا امام محمد کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر نشہ نہ ہو تو پھر حرام نہیں ہے (غیر خمر)

یہ سن کر خلیفہ صاحب خوش ہوئے۔ میں نے عرض کیا یہ امام محمد کا فتویٰ نہیں قول ہے اور مفتی بہ نہیں ہے۔

بشیر احمد صاحب ڈار میرے پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا مفتیٰ بہ کی تعریف کیجئے۔ میں نے عرض کیا، امام ابو حنیفہ کی مجلس میں ان کے کبار تلامذہ امام ابو یوسف، امام محمد، امام زفر وغیرہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے تھے۔ ہر شخص اپنی اپنی رائے کا اپنی بصیرت کے مطابق اظہار کرتا تھا۔ پھر بحث و مباحثہ کے بعد ایک قول پر با اتفاق آرا ٹھہر جاتا تھا یا کثرت رائے۔ دونوں صورتوں میں یہ آخری قول مفتیٰ بہ مانا جاتا ہے اور فقہائے امت اسی پر فتویٰ دیتے ہیں۔ دوسرے اقوال ساقط ہوجاتے ہیں۔ ان سے حجت اور سند نہیں لائی جاتی۔

یہ سن کر خلیفہ صاحب خاموش ہوگئے اور پھر کبھی اس مسئلہ کو انہوں نے موضوع بحث نہیں بنایا۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے، حکومت کے قائم کردہ میرج کمیشن کا اجلاس ادارہ میں ہو رہا تھا۔ سر عبدالرشید صدر تھے خلیفہ صاحب سیکریٹری۔ بیگم شاہنواز اور بیگم جی احمد بھی ممبر کی حیثیت سے شریک مجلس تھیں۔ کبھی کبھی خلیفہ صاحب ہم لوگوں کو بھی شریک بحث کر لیا کرتے تھے۔ اس روز بھی ہم سب موجود تھے۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا۔ اسلام میں یہ جائز ہے کہ ایک مسلمان کسی کتابی عورت سے شادی کرلے۔ لیکن کوئی مسلمان عورت کسی کتابی مرد سے نکاح نہیں کرسکتی ——— کیوں؟

کسی صاحب نے بتایا قرآن میں تو اس کی ممانعت نہیں ہے۔

خلیفہ صاحب کو یہ جواب پسند نہیں آیا۔ انہوں نے فرمایا۔ اسلام نے جو حقوق عورتوں کو دیئے ہیں ایک عیسائی یا یہودی عورت مسلمان کی بیوی بن کر وہ سب حاصل کر لیتی ہے۔ اگر ایک مسلمان عورت کسی عیسائی یا یہودی سے شادی کر لے تو وہ ان تمام حقوق سے محروم ہو جائے گی۔ گویا دوسرے الفاظ میں ایک کتابی عورت مسلمان کے گھر میں آ کر وہ سب کچھ پا لیتی ہے جو اس کا مذہب اسے نہیں دے سکا تھا۔ اور ایک مسلمان عورت یہودی یا عیسائی کے گھر میں جا کر ان تمام حقوق و مراعات سے محروم ہو جاتی ہے جو اسلام نے اسے دیئے تھے۔ کیا یہ کوئی معمولی فرق ہے؟

اس جواب نے فضا بدل دی۔

خلیفہ صاحب کو اکثر غیر ممالک سے لیکچر دینے کی دعوتیں ملتی رہتی تھیں اور وہ انہیں قبول بھی کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ امریکہ سے واپسی پر لندن ٹھہرے۔ وہاں نہ جانے کیا جی میں آئی کہ وطن واپس آنے کے بجائے اسپین چلے گئے۔ جہاں جا کر اقبال نے لکھا تھا:

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

خلیفہ صاحب نے اس دیس کی خوب سیر کی۔ قرطبہ دیکھا، غرناطہ گئے۔ الحمرا کی زیارت کی، جامع قرطبہ میں نماز پڑھی۔ وہاں سے ایک خط رفقائے ادارہ کے نام لکھا جس میں اپنی اس سیاحت کا چند سطروں میں ذکر کرنے کے بعد لکھا:

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

ان چند الفاظ میں خلیفہ صاحب نے پورا سفرنامہ لکھ ڈالا ـــــ جذبات سے بھرپور۔

اپنے نجی ملازمین کے ساتھ یا دفتر کے چپڑاسیوں کے ساتھ ان کا برتاؤ بے انتہا شفقت اور عنایت کا تھا۔ عام طور پر صبح اٹھنے کے بعد اپنی کوٹھی کے لان میں آ کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ وہیں اخبارات وغیرہ کا مطالعہ کرتے تھے۔ ملازم کو ہر روز ان کے بیدار ہونے سے پہلے کرسی لے جا کر وہاں بچھانی پڑتی تھی۔ لیکن خلیفہ صاحب اسے برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے لکڑی کے چند تختے ایک بنچ کی طرح بنوا کر وہاں رکھ دیئے تاکہ کرسی لانے اور لے جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ آئے اور بیٹھ گئے۔

دفتر کا ایک ملازم حمید اللہ چونکہ مہاجر تھا لہذا اسے رہنے کے لیے انہوں نے اپنے گھر میں جگہ دے دی۔ ہمیشہ اس کے دکھ سکھ میں شریک رہے۔ اس کی بیوی بیمار پڑی تو جو کچھ ہو سکا کیا۔ پھر اس کا انتقال ہو گیا۔ خلیفہ صاحب نہ صرف خود دھوپ کی تیزی اور شدت کے باوجود نماز جنازہ میں شریک ہوئے بلکہ رفقائے ادارہ کو بھی دعوت دی کہ جو چلنا چاہے چلے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا دل انسانی ہمدردی سے کتنا معمور تھا۔

خلیفہ صاحب کو اپنی اولاد سے غیر معمولی محبت تھی۔ ان کی صاحبزادی ایم۔ اے ہیں۔ تکمیل تعلیم کے لیے امریکہ بھی جا چکی ہیں۔ فلسفہ سے دلچسپی وراثت میں پائی ہے۔ ان کا ذکر بڑی محبت سے کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ امریکہ جانے لگے تو فرمایا، اس بہانے عارف سے ملاقات ہو جائے گی، بہت دنوں سے اسے نہیں دیکھا ہے۔ واپس آئے تو ایک موٹر اپنے ساتھ لائے۔ کہنے لگے روپے کم پڑ گئے تھے۔ عارف نے جو کچھ جمع کیا تھا سامنے رکھ دیا۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ عارف صاحب امریکہ سے واپس آ جائیں اور یہیں رہیں۔ باپ کی آنکھوں کے سامنے۔ ماں کی آغوش محبت میں لیکن انہوں نے کبھی اصرار نہیں کیا۔ وہ چاہتے تھے عارف صاحب خود ہی فیصلہ کریں۔ اپنا فیصلہ ان پر عائد کرنا منظور نہ تھا بزرگوں سے بھی عقیدت رکھتے تھے۔ حضرت غوث شاہ صاحب سے بہت متاثر تھے۔ تذکرۂ غوثیہ کے اکثر واقعات جو حضرت صاحب کی کرامات اور خرق عادات پر مبنی تھے جزم و یقین کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے۔ راولپنڈی میں کوئی مجذوب تھے ان سے بھی بہت متاثر تھے۔ مری جاتے آتے وقت اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کے کشف و کرامت کے واقعات بیان کرتے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے میں اپنی لڑکی کے ساتھ ملنے گیا۔ لڑکی کو دیکھتے ہی انہوں نے مسکرا کر فرمایا اس کی شادی اس کی موسی کے لڑکے سے ہو رہی ہے۔ اچھا ہے۔ خلیفہ صاحب کہتے تھے یہ بات سن کر میں بہت متعجب ہوا کیونکہ واقعی اس کی شادی اس کے خالہ زاد بھائی سے طے ہو چکی تھی۔ اپنی ایک اور عزیزہ کا قصہ بیان کرتے تھے کہ ان کے شوہر نے جس کام میں ہاتھ ڈالا ناکام ہوئے۔ وہ ان مجذوب صاحب کے پاس پہنچیں۔ دیکھتے ہی آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور کہا، "دروازے بند ہیں ہم کچھ نہیں کر سکتے"۔

خلیفہ صاحب کو اردو زبان سے اتنا شغف تھا کہ ان کے گھر کی زبان اردو ہی تھی۔ ایک مرتبہ غالباً سنہ ۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے کہ میں اور حنیف صاحب مری گئے۔ خلیفہ صاحب نے ایک بنگلہ کرایہ پر لے رکھا تھا جہاں اپنی بیگم اور صاحبزادی کے ساتھ مقیم تھے۔ قریب ہی ہوٹل سنٹرل تھا جہاں ہم دونوں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سہ پہر کو دوسرے تیسرے دن وہاں چلے جاتے ایک دفعہ ہم لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ان کی ننھی سی نواسی کھیلتی ہوئی آئی۔ خلیفہ صاحب نے اسے گود میں لے لیا اور چائے پلانے لگے۔ پھر فرمایا آج اس کی آپا کی شامت آ گئی تھی۔ قریب تھا کہ اس کی ماں اسے نکال دیتی۔ میں نے پوچھا کیوں؟ فرمایا آج اس لڑکی کے منہ سے پنجابی کا ایک لفظ نکل گیا تھا جس سے اس کی ماں برافروختہ ہو گئی کہ یہ آیا تو بچی کی زبان بگاڑ دے گی۔

بہت سی باتیں ہیں لیکن اس مختصر سی مجلس میں تفصیل کا موقع کہاں؟

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لیے

پروفیسر شیخ محمود احمد

مردِ درویش

میرے ذہن میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کا نمایاں ترین نقش ان کی درویشی ہے۔ ۱۹۴۹ء کا ذکر ہے وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے لاہور آئے ہوئے تھے۔ حیدرآباد یونیورسٹی سے ریٹائر ہوئے تھے اور ریاست حیدرآباد کے سقوط کے بعد کوئی پنشن ملنے کی توقع نہ تھی۔ ابھی پاکستان میں بھی نہ کوئی کام کر رہے تھے نہ حسب طبیعت کوئی کام ملنے کی امید تھی پنشن لینے کے بعد اپنے آبائی وطن کشمیر میں سکونت کا ارادہ رکھتے تھے اور اسی خیال سے جنگ کے دوران میں جب سوائے صنعت کار یا تاجر پیشہ کے کوئی اور مکان بنانے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا انہوں نے سری نگر میں بڑا پیارا بنگلہ تعمیر کروایا۔ زندگی کی تمام سہولتیں اس میں جمع کیں۔ پچاس کنال کے قریب زمین بنگلہ کے ساتھ لی اور اس میں باغ لگوایا۔ زندگی بھر کی جمع کی ہوئی کتابیں اس میں رکھیں۔ لیکن وہاں بھی حالات اس سرعت سے بدلے کہ آتے ہوئے اپنا کار بھی نہ لا سکے زندگی بھر کا اثاثہ اس مکان پر لگا چکے تھے۔ اب نہ تنخواہ رہی تھی نہ پنشن۔ نہ مکان نہ کتابیں۔ نہ زندگی کی دیگر سہولتیں اور ضرورتیں۔ میں انہیں چھ سال پہلے سے جانتا تھا اور بے انتہا حیران تھا کہ ان کے لباس اور فرنیچر اور کھانے میں تو فرق تھا لیکن ان کی علمی گفتگو، ان کے اشعار، ان کے لطیفے اور بذلہ سنجی اسی جگہ قائم تھی۔

میں اس سے چند ہی ماہ پہلے ہجرت کر کے کشمیر سے لاہور پہنچا تھا۔ میری عمر اس وقت ۲۲ سال تھی اور ان کی ۵۶۔ مستقبل اور زندگی میرے سامنے تھی اور ان کی پشت پر۔ وہ ایک زندگی کا اثاثہ لٹا کر آئے تھے اور میرے پاس تھا ہی کیا جو لٹاتا۔ میں اس زمانہ میں حوصلہ، یقین اور مثبتیت کا درس لینے لاہور جیسے علمی گہوارے میں اسی لٹے پٹے بوڑھے کے پاس حاضر ہوتا تھا۔

اسی زمانے میں انہیں ایک اور نقصان بھی ہوا۔ ایک عزیز آئے اور ان سے ۲۵ ہزار روپے مانگ کر لے گئے کہ کاروبار میں لگائیں گے۔ خلیفہ صاحب روپیہ دیتے ہوئے گھر میں کبھی مشورہ نہ کرتے تھے۔ جس نے جو مانگا اگر پاس ہوا تو فوراً دے دیتے تھے۔ کاروبار میں نقصان ہوا تو گھر میں معمولی طور پر یہ بات کر چھوڑی جیسے پانچ دس روپے کی بات ہو۔ گھر والوں کو قدرتاً تشویش تھی کہ روپیہ مانگنا چاہیئے۔ پیچھا کرنا چاہیئے۔ لیکن ان کا یہ کہنا بھی انہیں ناگوار ہوتا تھا۔ کہتے تھے جب ہو گا ضرور دے دیگا۔

جب بھی ان سے کسی کام کاج کی بات کی جاتی تو فوراً ٹال دیتے۔ بہت مجبور کرتے تو کہہ دیتے کہ ساری عمر پڑھتے رہے ہیں ذرا جم کے بیٹھے تو کچھ کہہ بھی ڈالیں گے۔ رہنے کو گھر تو ہو ہی گیا ہے۔ یہ بھی نہ ہوتا تو اتفاقاً اندرون موچی دروازہ ایک آبائی مکان تو ہے ہی اس میں میرا بھی کچھ حصہ ہے۔ وہاں بھی بڑے مزے سے رہ سکتا ہوں۔ اور پھر کوئی حکایت، کوئی لطیفہ، کوئی علم و حکمت کی بات کر دیتے۔ غالباً ایک ایسے ہی موقع پر حضرت سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات سنائی کہ وہ علاوہ علم و عرفان میں بلند مقام رکھنے کے دنیوی ثروت میں بھی بڑے ممتاز تھے۔ وہ بہت بڑے بین الاقوامی تاجر تھے۔ اس پیمانے کے کہ انہیں اسباب تجارت کی حمل و نقل کے لیے اپنے جہازوں کا بیڑا رکھنا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ درس فرما رہے تھے کہ کوئی کارندہ گھبرایا ہوا آیا اور کہا تمام جہاز فلاں ملک سے واپس آتے ہوئے سمندری طوفان میں گھر گئے اور سامان سمیت سب ڈوب گئے۔ سید والامقام نے کہا الحمدللہ اور درس پہلے کی طرح جاری رکھا۔ دوسرے روز پھر درس فرما رہے تھے کہ وہی کارندہ بھاگا بھاگا آیا اور کہا کہ کل والی اطلاع غلط تھی۔ طوفان تو واقعی شدید تھا لیکن قدرت کا معجزہ ہے کہ کوئی جہاز بھی نہیں ڈوبا۔ حضور جیلانی نے کہا الحمدللہ اور درس پہلے کی طرح جاری رکھا۔ ایک طالب علم جو دونوں روز موجود تھا پوچھے بغیر رہ نہ سکا کہ حضور آپ نے کل جہازوں کے ڈوبنے کی خبر سن کر بھی الحمدللہ کہا اور آج جہازوں کے بچ جانے پر بھی الحمدللہ کہا۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟ حضور نے جواب دیا کہ جب ڈوبنے کی خبر سنی تو میں نے اپنے دل کو ٹٹولا کہ کہیں اس خبر سے اس میں کوئی مایوسی یا رنج یا تکلیف کا جذبہ تو نہیں پیدا ہوا۔ چونکہ ایسی کوئی چیز دل میں موجود نہیں تھی اس لیے میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور کہا الحمدللہ۔ دوسرے روز جب سب جہازوں کے بچ نکلنے کی خبر ملی تو میں نے پھر دل کو ٹٹولا کہ اس میں کہیں فخر و ناز یا کم از کم غیر معمولی مسرت اور اٹھان تو نہیں۔ اور چونکہ یہ جذبہ بھی نہیں تھا اس لیے میں نے دوبارہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور الحمدللہ کہا:

دل حریم اوست جز با او مدہ

چنانچہ اپنی تکلیف کی نہ بات کرتے تھے نہ ان کی نشست و برخاست اور گفت و شنید سے اس کا کوئی اثر ان پر نظر آتا تھا۔ البتہ ملنے والے سے اس کی بات ضرور کرتے تھے۔ میں بھی ابھی ہجرت کے بعد ملازم نہیں ہوا تھا۔ مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا کہ یہ روپے کی تنگی نہ ہو تو آدمی ملازمت کا دھندا کبھی نہ کرے۔ کہنے لگے روپیہ ہو تو کیا کرو؟ میں نے کہا فلاں کاروبار کر لوں۔ تفصیلیں پوچھتے رہے۔ کہنے لگے کتنا روپیہ ہو تو یہ کام کر سکو گے؟ میں نے کہا دس ہزار اور پھر کچھ اور بات ہوتی رہی۔ اسی دوران اندر گئے اور میرے ہاتھ میں ایک چک دے دیا۔ میں نے رقم دیکھی تو دس ہزار روپیہ تھی۔ چک بیرر تھا اور حسب معمول نہ رسید نہ پرچہ۔ میں نے پوچھا بھی تو کہنے لگے اس کی کیا ضرورت ہے۔ مجھ جیسے درس و تدریس سے تعلق رکھنے والوں سے کاروبار کیا ہوتا دخود بھی کہا کرتے تھے جو کچھ جانتے ہیں وہ کچھ کر بھی

لیتے ہیں اور جو کچھ نہیں جانتے وہ پڑھا لیتے ہیں؟ کچھ ہی دنوں میں بارہ سو کا نقصان کر دیا۔ ان سے ذکر کیا تو کہنے لگے کاروبار میں یہ ہوتا ہی ہے اور تمہیں معلوم نہیں بنیوں کی ایک کہاوت ہے پہلے سال چٹی! دوسرے سال وٹی اور تیسرے سال کھٹی۔ یعنی پہلے سال نقصان ہوتا ہے، دوسرے سال معاملہ برابر رہتا ہے اور تیسرے سال منافع ہوتا ہے۔ میں جو پہلے ہی اتنے درویش صفت آدمی سے دس ہزار روپیہ باوجود ان کی نازک مالی حالت کے لے چکا تھا، اپنے آپ میں پہلے دو سالوں کی کٹھن منزل کو برداشت کرنے کی اخلاقی قوت نہ رکھتا تھا۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ باقی رقم ان کو لوٹا دوں اور نقصان والا حصہ پھر کبھی انہیں دے دوں۔ جب رقم کا چیک انہیں دیا اور بقایا کے متعلق کہا تو کہنے لگے کہ یہ تو اختر اک کا معاملہ ہوتا ہے۔ بارہ سو کا نقصان ہوا ہے تو چھ سو مجھے برداشت کرنا چاہیئے اور چھ سو تمہیں۔ اس وقت تو خیر میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی اور انہوں نے بھی کبھی اس چیز کا مجھ سے ذکر نہیں کیا۔ دو تین سال کے بعد میں نے نقصان والی رقم کا چیک بھیجا تو مجھے ایسا خط لکھا کہ جیسے ان میں نہ کوئی نیکی تھی اور نہ ہے اور دنیا بھر کی نیکی اور دیانت میرے ہی حصے میں آئی ہے!

مشہور مصنف لوئی فشر نے MEN AND POLITICS میں اپنی ایک گھریلو بات لکھی ہے۔ وہ اس زمانے میں ماسکو میں رہتے تھے۔ ان کے پانچ سالہ بچے نے اپنی ماں سے جو خود بھی مشہور جرنلسٹ ہیں اخبار پراودا میں ایک کارٹون کا مطلب پوچھا۔ ماں نے کہا اس کا مطلب تم نہیں سمجھ سکتے تو بچے نے فوراً جواب دیا کہ اگر آپ واقعی کسی چیز کو سمجھتی ہوں تو آپ ضرور اسے سمجھا سکیں گی۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ان یگانۂ روزگار ہستیوں میں سے تھے جنہیں کبھی کسی کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تم فلاں چیز سمجھ نہیں سکتے۔ انہوں نے علم و شعر و حکمت کو اس حد تک سمجھا ہوا تھا کہ وہ اسے لطیفوں اور حکایتوں کی شکل میں فلسفہ و شعر سے نابلد لوگوں کو بھی سمجھا سکتے تھے۔ علم و حکمت کا کوئی مشکل سے مشکل مسئلہ ایسا نہ تھا جو ان کی زبان سے سننے کے بعد اپنی گرہ کھول نہ دیتا ہو۔ انداز ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ جواب کسی شعر سے شروع کرتے یا کسی لطیفہ یا کہانی سے اور اس شعر کی تشریح میں یا اس کہانی یا لطیفہ سے منسلک قہقہے میں ساری دقت یوں دور ہو جاتی کہ حیرت ہوتی تھی کہ وہ دقت تھی کہاں۔

لیکن اب اس چیز کو دہرانا اور بیان کرنا میرے بس میں نہیں۔ اس چیز کا احساس اس وقت بھی تھا جب وہ زندہ تھے کہ انمول موتی ان کے منہ سے نکل کر ہوا میں غائب ہو رہے ہیں۔ اگر کوئی زندہ قوم ہوتی تو وہ اسٹینوگرافر ہر وقت ان کے ساتھ رکھتی جو ان کی ہر بات کو ضبطِ تحریر میں لے آتے اور اگر یہ ہوتا تو آج بیسیوں جلدیں علم و حکمت سے بھری ہوئی قوم کو زندگی کا درس دینے کے لیے موجود ہوتیں۔

قوم کو کیا کھول خود اپنی خامی پر دکھ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جانسن ہم میں موجود تھے، ذرا آگے بڑھ کر باسول بن جانا کچھ مشکل نہ تھا۔ لیکن کبھی بھی گھر جا کر وہ بات نہ لکھی جو ان کی زبان سے سنی تھی۔ سوائے ایک بار کے، وہ بھی آج سے پندرہ

سال پہلے اور وہ بھی اب ملتی نہیں۔

اب تو صرف وہ کتابیں ہیں جو انہوں نے خود لکھیں۔ لکھنے کا اسلوب وہی تھا جو بات کرنے کا تھا ہمیشہ قلم برداشتہ لکھتے تھے اور لکھے ہوئے کو دہراتے نہیں تھے۔ یہ بحیثیت مصنف ان کی خامی تھی اور جب وہ زندہ تھے تو میں نے کئی بار ان سے اس کی شکایت بھی کی۔ لیکن اب خوش ہوں کہ وہ ہماری طرح دہرانے اور سہرانے نہیں بیٹھے ورنہ شاید وہ دولت بھی ہمیں نہ ملتی جو خوش قسمتی سے اب ہم سے چھین نہ سکے گی۔

میں نے عمداً اس مضمون کا عنوان مرد درویش رکھا ہے حالانکہ وہ علم و عرفان کا ایک سمندر بھی تھے اور اس پہلو پر بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کی ایک وجہ تو اپنی کوتاہ قلمی اور کوتاہ علمی ہے کہ نہ ان کے علم کو بیان کر سکتا ہوں اور نہ ان کے اسلوب کی کوئی مثال اب یاد ہے اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا تخاطب ذہن سے زیادہ قلب و وجدان سے ہوتا تھا۔ شاید یہی وجہ ہو کہ شعور میں کوئی بات نہیں اور کم از کم خوش فہمی یہ ضرور ہے کہ وجدان میں سب باتیں محفوظ ہیں۔

جب ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ قائم کرنے کے لیے حکومت نے انہیں معین کیا تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے مچھلی کو پانی مل گیا ہو۔ ادارے کو انہوں نے بے انتہا باعمل ادارہ بنایا۔ کئی لالچ ان کے راستے میں ایسے آئے کہ کوئی دنیا دار ہوتا تو ادارے کو چھوڑ دیتا۔ مثلاً دو بار پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلری انہیں پیش کی گئی۔ لیکن دونوں بار انکار کر دیا کہ میں اس ادارہ کا کام کرنا چاہتا ہوں۔ ایک بار تو میں نے بھی ان سے پوچھا کہ وہ کیوں انکار پر مصر ہیں، جو جواب دیا وہ الفاظ تو مجھے یاد نہیں لیکن اس کا مفہوم میرے جیسا معاشیات کا طالب علم اس طرح بیان کر سکتا ہے کہ کام کی قدر یافت کی قدر سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

کسی کے متعلق برائی یا بدنیتی کا وہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ جب سری نگر کا بنگلہ بنانا تھا تو ڈیزائن تیار کروالیا اور ایک کارندہ مقرر کر دیا کہ اس کے مطابق چیز بنوا دے۔ اس حد تک تو ان کی مجبوری جائز تھی کیونکہ نہ کسی قسم کی بھاگ دوڑ کا کام انہوں نے خود کیا تھا اور نہ کر سکتے تھے۔ جس انداز سے وہ کارندہ خرچ کر رہا تھا اس سے صاف نظر آتا تھا کہ جنگ کی گرانی کے علاوہ بھی کوئی غیر معمولی وجہ اس خرچ کی تھی۔ اور وہ وجہ باقی سب لوگوں کو نظر آ رہی تھی سوائے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے۔ کوئی کچھ کہتا بھی تو جواب دیتے آپ لوگ خواہ مخواہ بدظنی کر رہے ہیں۔ چنانچہ مکان کی تکمیل کے بعد بھی وہ ان کا ملازم رہا اور باغ لگانے کا کام بھی اسی سے کروایا گیا۔

اسی طرح ایک اور کارندہ تھا جسے شمل میں باغ لگوانے کے لیے ملازم رکھا۔ مختلف حیلوں سے وہ جائز خرچ سے ہزاروں روپیہ زیادہ وصول کرتا رہا۔ سب جانتے تھے کہ وہ ان کی تن آسانی اور روپے پیسے کے معاملے میں تفصیل سے گریز سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے لیکن آخر تک انہیں اس کی ایمانداری کا قطعی یقین تھا اور اگر کوئی شبہ کی بات کرتا بھی تو وہ

یوں محسوس کرتے جیسے دوسرے کا شبہ بھی ان کا اپنا قصور ہے، چنانچہ انہیں فرصت میں وہ اس کے لیے کپڑے یا کوئی اور تحفہ ضرور بھجوا دیتے، اور چونکہ وقت گزرنے اور معاملہ کی اور وضاحت ہونے کے ساتھ زیادہ لوگ زیادہ موقعوں پر یہ بات کہنے لگے۔ اس لیے تحفوں کی مقدار بھی ہمیشہ بڑھتی ہی رہی۔ میں اس کارندہ سے ان کی وفات کے بعد نہیں ملا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ انہیں ایک فرشتہ سمجھتا ہوگا۔

اور کون جانے کہ وہی ٹھیک سمجھتا ہو!

محمد حنیف ندوی

مرحُوم کی کچھ خُوبیاں

کچھ لوگ پیدائشی طور پر عظیم شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو ذاتی جد وجہد سے عظمت کے بام رفیع تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ اور کچھ حضرات ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی عظمت اکثر حالات و اتفاقات کی سازگاریوں کی مرہون منت ہوتی ہے۔ خلیفہ صاحب کا شمار پہلی اور دوسری صف میں ہوتا ہے۔ انہوں نے جہاں فطرت سے عالی ظرفی کی نعمت پائی وہاں کسب و اکتساب میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس جامعیت کے انسان دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں جو بیک وقت مفکر بھی ہوں اور خوش گفتار اور خوش مذاق بھی۔ جن میں تصوف و فلسفہ کا امتزاج نہایت متوازن ہو۔ جو مشرق کے مذاق سخن سے بھی آشنا ہوں اور مغرب کی سحر طرازیوں سے بھی اسی انداز سے آگاہ۔ جنہوں نے ٹینی سن اور حافظ کے جام و سبو کو ٹکراتے دیکھا ہو اور دونوں سے یکساں استفادہ کیا ہو۔ اس وسعت اور خوبی کے انسان روز روز کب عالم فانی میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ علم و فضل سے قطع نظر، اخلاقی اعتبار سے بھی خلیفہ صاحب کا پایہ بہت اونچا تھا۔ ایک خاص ادا ان کی یہ تھی کہ کسی شخص میں اگر خوبی دیکھتے تو اس کی بے حد تعریف کرتے اور سراہتے، اگرچہ وہ شخص مرتبہ و منزلت کے اعتبار سے کہیں کم درجہ کا ہو۔ چنانچہ اپنے ایک ملازم کی دیانت داری اور صفاتِ حمیدہ کے اس درجہ قائل تھے کہ اس کو برملا اخلاقیات میں اپنا استاد مانتے۔

اپنے رفقائے ادارہ پر جان چھڑکتے تھے اور ان کی صحبت و رفاقت کو حاصل زندگی قرار دیتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ روزانہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جب تک مختلف موضوعوں پر ان سے جم کر بات چیت نہ کر لیتے اور کسی کام کی طرف متوجہ ہی نہ ہو پاتے یہی نہیں اس گفتگو کو اس درجہ اہم سمجھتے تھے کہ اس میں مشکل ہی سے ناغہ ہوتا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ گورنر جی جی اور بڑے بڑے وزراء سے طویل ملاقاتیں ہوئیں مگر ان کے ذوق و فکر کی تسکین نہ ہو سکی۔ اس لیے ان سے نمٹ کر سیدھے ادارے میں آئے اور جب تک رفقاء سے اپنے ڈھب کی باتیں نہ کر لیں گھر نہیں جا سکے۔ ایک قابل تعریف وصف ان کا یہ تھا کہ کسی دوست کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہمارے ایک ندوی بھائی جن سے خلیفہ صاحب صرف ایک ہی مرتبہ ملے تھے اور وہ بھی سرسری طور سے اتفاق سے ہندوستان چلے گئے۔ واپسی میں مشکلات پیش آئیں۔ انہوں نے خلیفہ صاحب کو لکھا کہ میرے بچوں کو براہِ کرم ایک صد روپیہ بھیج دیجئے، خلیفہ صاحب نے خط پڑھا تو بغیر ادنیٰ تامل کے یہ رقم ان کے بچوں کو بھجوا دی۔

اکثر ایسا ہوتا کہ بجٹ کے منظور ہونے اور وصول ہونے میں دیر ہو جاتی اور ہمیں تشویش لاحق ہوتی کہ تنخواہوں کا کیا ہوگا اور روزمرہ مصارف کی گاڑی کیونکر چلے گی۔ خلیفہ صاحب سے ذکر ہوتا تو وہ اپنے حساب میں سے چیک کاٹ دیتے اور ہماری تمام تشویشوں کو چشم زدن میں دور کر دیتے۔

اللہ تعالیٰ پر ان کے ایمان کا یہ عالم تھا کہ ہم نے آٹھ دس برس کی رفاقت میں ان کو کبھی مایوس اور پریشان نہیں دیکھا اکثر کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے ہمارا یہ سمجھوتا ہے کہ ہم حتی الامکان حرص و آز کے دائروں کو وسیع نہیں ہونے دیں گے اور وہ ہماری ضروریات کو بہر حال پورا کرتا رہے گا۔

فلسفیانہ اصطلاح میں وہ رجائی (OPTIMISTIC) تھے۔ قنوطی (PESSIMISTIC) ہرگز نہیں تھے اکثر دونوں مدرسہ ہائے خیال میں موازنہ کرتے اور کہتے کہ جہاں تک دھوکا کھانے اور نقصان برداشت کرنے کا تعلق ہے رجائی اور قنوطی کی اس میں کوئی تخصیص نہیں۔ نہ رجائی کی رجائیت پسندی کو اس سے مفر ہے اور نہ قنوطی کی یاس پسندی ہی اس کو روک سکتی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ مایوسی سے پہلے مایوس ہو جانا تقاضائے خرد نہیں۔ بلکہ جب تک رجا و امید کا رشتہ قائم ہے اس کو خواہ مخواہ توڑا کیوں جائے اور بلا وجہ پریشانی کو دعوت کیوں دی جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کی رجائیت کسی فلسفہ کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ان کا مزاج ہی رجائیت پسند تھا۔ یوں بھی ان دونوں فلسفوں میں، فلسفہ اور نقطۂ نظر کا اختلاف اس درجہ نہیں ہے جس درجہ مزاج اور طبیعت کا ہے۔

ایک نہایت ہی پیاری ادا ان کی یہ تھی کہ جب بڑے بڑے مالداروں اور عہدہ داروں سے ملتے تھے تو انہیں اپنی سطح پر لا کر بات چیت کرتے اور جب چھوٹوں اور عزیزوں سے گفتگو کرنے کی نوبت آتی تو کسی طرح بھی ان میں کسی کمتری کا احساس نہ پیدا ہونے دیتے۔

اسلام سے متعلق ان کا خاص نقطۂ نظر تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ جب تک اس کی از سرِ نو تعبیر و ترجمانی نہ کی جائے اور اس کی عمارت کو بالکل ہی نئی بنیادوں پر قائم نہ کیا جائے اس وقت تک نئے ذہن اسے قبول نہیں کر سکیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ الٰہیات سے لے کر فقہ اور معاشرت تک کے مسائل پر پھر سے غور ہونا چاہیئے۔ اور چونکہ جدید فلسفہ کی تمام شاخوں پر ان کی نظر بہت گہری تھی اس لیے قدرتاً ان کی یہ خواہش تھی کہ اسلام کی نئی صورت اظہار (REPRESENTATION) بالکل جدید پیمانوں اور اصطلاحوں کو ملحوظ رکھ کر ہونی چاہیئے۔ اس باب میں لطیفے کی بات یہ ہے کہ جب پرانے انداز کے علماء سے ان مسائل پر گفتگو ہوتی تو یہ خوب خوب ان کو جھنجھوڑتے تاکہ ان کے جمود میں تغیر پیدا ہو، اور جدید تقاضوں کا احساس ان میں کروٹ بدلے۔ لیکن جب جدید گروہ کا سامنا ہوتا تو ان کے مقابلہ میں ایک کٹر مسلمان کی حیثیت اختیار کر لیتے۔ مذہب میں قدامت پرستی اور تشدد (ORTHODOXY) کے خلیفہ صاحب شدید مخالف تھے

مگر اگر کوئی مستشرق پاپادری ذہن وفکر کا امریکن ادارے میں آ نکلتا اور اس گروہ کی مخالفت کرتا یا تعددِ ازدواج وغیرہ پر اعتراض کرتا تو اس کو برداشت نہ کر سکتے۔ اس وقت ان کا جوش تبلیغ، ان کی حمیت دینی، اور عصبیت اسلامی دیکھنے کے قابل ہوتی۔ روان دوان انگریزی میں موجودہ تہذیب اور کلچر کی خامیوں کی اس فصاحت و بلاغت سے نشاندہی کرتے کہ سننے والے انگشت بدنداں رہ جاتے۔ چونکہ یورپ میں برسوں گذار چکے تھے اس لیے ان لوگوں کی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف تھے۔

ان کے فضائل کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ بحیثیت مجموعی ان کی شخصیت بہت جاذب اور پیاری تھی۔ میں جب پہلی دفعہ ان سے ملا تو حسبِ عادت مسئلہ اجتہاد پر ان سے خوب خوب جھڑپیں ہوئیں۔ پھر جب انہوں نے دیکھ لیا کہ میں عقائد کے معاملہ میں انہی کی طرح جذباتی ہوں اور جذبات کے ساتھ ساتھ دلائل بھی رکھتا ہوں تو بہت خوش ہوئے۔ اور اسی مجلس میں کہہ دیا کہ میں اس مسئلہ کے مالہ اور ما علیہ پر ایک تفصیلی کتاب لکھوں جس میں تمام ادلہ پر سیر حاصل بحث ہو۔ اور جس میں یہ ثابت کیا جائے کہ اسلامی اجتہاد میں جدید سے جدید تقاضوں کو سمو لینے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔ چنانچہ میری کتاب مسئلہ اجتہاد کا نقشہ قریب قریب اسی جھڑپ کے بعد مرتب ہوا۔

مضمون تشنہ رہے گا اگر عام معاملات میں خلیفہ صاحب کے اصولِ کار کی وضاحت نہ کی جائے۔ اس سے پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ ان کا فلسفۂ حیات رجائیت پر مبنی تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر شخص کو اولاً پیکر خیر سمجھتے اور اس وقت تک اس کے بارے میں حسنِ ظن ہی سے کام لیتے جب تک واقعات وحقائق سے یہ ثابت نہ ہو جاتا کہ یہ شخص اچھا نہیں ہے۔ یہ اصول ان کی طینت میں اس درجہ راسخ اور رچا ہوا تھا کہ قبل از وقت کسی شخص کے بارے میں ان کو یہ یقین دلانا سخت مشکل تھا کہ یہ شخص قابلِ اعتماد نہیں ہے۔

آخر میں ایک خوبی اور سن لیجئے۔ وہ جہاں جدید تعلیم سے لیس اور خیالات وافکار میں بالکل الٹرا ماڈرن تھے۔ وہاں تصوف اور صوفیاء کے بے حد قائل تھے اور اس سلسلہ میں بعض ایسی چیزوں کے بھی قائل تھے عام حالات میں جن کی توقع ان سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ مثلاً وہ برملا کہا کرتے تھے کہ یہ عالم ہست وبود صرف مادیت ہی پر مبنی نہیں ہے۔ اور یہاں جو کچھ بھی ہے وہ مادہ ہی کے اظہار ونمود کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کے پہلو بہ پہلو اسی دنیا میں ایک روحانی عالم بھی آباد ہے جس کا اس عالم اسباب سے گہرا تعلق ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر خلیفہ صاحب کی زندگی کا سلسلہ اور دراز ہوتا تو وہ فطری طور پر افکار وجذبات کے اس موڑ پر پہنچ گئے تھے جہاں ایک شخص ترکِ دنیا اختیار کر لیتا ہے اور صرف اعلیٰ روحانی اقدار کے حصول کے لیے زندہ رہتا ہے۔ ان کی سیرت و کردار کی تبدیلیوں کا جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے وثوق اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان کو اور مہلت مل جاتی تو ان کے رجحانات ایک نہایت اعلیٰ درجہ کے فلسفی وصوفی کی شکل اختیار کر لیتے۔ یہی ان کی منزل اور نصب العین تھا۔ آخر ایک عاشقِ رسولؐ، رومیؒ اور اقبالؒ کا شیدائی اپنے لیے اس سے کم درجہ کو پسند بھی کیوں کرتا؟

محمد مظہر الدین صدیقی

خلیفہ صاحب کے مذہبی عقائد

خلیفہ صاحب سے میں پہلے پہل اس زمانہ میں روشناس ہوا جب وہ حیدر آباد (دکن) میں جامعہ عثمانیہ میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ اس زمانہ میں وہ ٹاؤن ہال باغ عامہ میں آرو بندو گھوش کے فلسفہ پر کچھ تقاریر فرما رہے تھے۔ اگرچہ فلسفہ میرا مضمون نہ تھا لیکن کچھ طبعی ذوق اور مناسبت کی وجہ سے میں ان کی تقاریر سننے جایا کرتا تھا۔ خلیفہ صاحب کی تقریر میں ان کی گفتگو کی طرح ایک خاص شگفتگی تھی۔ وہ فلسفہ کے نہایت دقیق مسائل کو ایسے آسان اور دلچسپ انداز سے سمجھاتے تھے کہ معمولی سمجھ کا آدمی بھی ان سے کچھ نہ کچھ ضرور اخذ کر لیتا تھا۔ چنانچہ اس موقع پر بھی مرحوم نے آرو بندو گھوش کے تصوف کو ایسے شگفتہ پیرایہ میں بیان فرمایا کہ بہت سی باتیں جو پہلے دشوار اور پیچیدہ نظر آتی تھیں آسانی سے سمجھ میں آگئیں۔ اس کے بعد اگرچہ مرحوم حیدر آباد میں عرصۂ دراز تک مقیم رہے لیکن غائبانہ تعارف کے سوا کبھی ان سے ملنے اور گفتگو کرنے کا موقع نہیں ملا۔ البتہ کبھی کبھی ان کے متعلق کچھ باتیں سننے میں آجاتی تھیں۔ مثلاً یہ کہ مولوی صاحبان کو خلیفہ صاحب سے ایک خاص پرخاش ہے کیونکہ ان کے خیالات سے وہ شدید اختلافات رکھتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی سننے میں آتا تھا کہ خلیفہ صاحب مولویوں پر پھبتیاں کسنے میں استاد ہیں اور موقعہ مل جائے تو انہیں خوب ستاتے ہیں۔ بہرحال ان کی آزاد خیالی اور بذلہ سنجی خشک مذہبی طبائع کو ناگوار تھی۔

خلیفہ صاحب سے میری پہلی ملاقات مری میں ہوئی جہاں وہ اپنے صاحبزادے عارف صاحب کے یہاں مقیم تھے۔ اس زمانہ میں میں پشاور میں بسلسلۂ ملازمت سکونت پذیر تھا۔ لیکن یہ پہلی ملاقات نہایت مختصر تھی اور اس سے مجھے خلیفہ صاحب کے متعلق کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوئی۔ اس زمانہ میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ قائم ہو چکا تھا۔ اور خلیفہ صاحب اس کے ڈائرکٹر تھے مگر ابھی انہیں موزوں اشخاص کی تلاش تھی۔ ادارہ کی رکنیت اور رفاقت کا شرف پہلے پہلے ہمارے دوست ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کو حاصل ہوا جو اب کراچی میں اقبال اکیڈمی کے ناظم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بعد دوسرے نمبر پر میں ادارہ کی رکنیت سے سرفراز ہوا۔ میرے مذہبی خیالات میں اس وقت تک کافی جمود تھا۔ اسی طرح ڈاکٹر رفیع الدین صاحب بھی اپنے مذہبی افکار کے اعتبار سے

نہایت راسخ العقیدہ تھے۔ اس کے بعد ہمارے ادارہ میں دو اور رفقائے کار داخل ہوئے جن کا تعلق طبقۂ علماء سے تھا۔ غرض کہ ایک طرف تو خلیفہ صاحب معہ اپنی تمام آزاد خیالی اور فلسفہ آرائی کے ادارہ کے ناظم تھے اور دوسری طرف رفقائے ادارہ سب کے سب کم و بیش آبائی عقائد کے پیرو تھے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ خلیفہ صاحب اس گاڑی کو کس طرح چلائیں گے جس کے چاروں پہیے بے جوڑ تھے۔ میرا جس وقت ادارہ میں تقرر ہوا تو ڈرتے ڈرتے اور جھجکتے ہوئے لاہور آیا۔ کیونکہ خلیفہ صاحب کی آزاد خیالی کے باعث یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ ممکن ہے کبھی میرے اور ان کے خیالات میں ٹکراؤ ہو جائے۔ اس نئی زندگی کے آغاز میں مجھے بعض وقت دماغی الجھن ضرور رہتی تھی کیونکہ خلیفہ صاحب کی عادت تھی کہ وہ روزانہ رفقائے ادارہ سے کم از کم دو تین گھنٹے علمی گفتگو فرماتے تھے۔ دوران گفتگو میں بعض وقت ان کی زبان سے ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جن سے مجھے ان کے اسلام و ایمان میں شک ہونے لگتا۔ ابتدا میں مجھے اس سے کافی پریشانی ہوئی۔ لیکن جیسا جیسا وقت گزرتا گیا اور خلیفہ صاحب کے خیالات سے زیادہ گہری واقفیت ہونے لگی یہ تمام شکوک و شبہات زائل ہو گئے۔ اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ خلیفہ صاحب نہایت پکے مسلمان ہیں لیکن ان کا انداز فکر فلسفیانہ اور متصوفانہ ہے۔ اس لیے وہ اسلام کو کسی اور رنگ میں دیکھتے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ مذہبی عقائد کے دائرہ میں دینیاتی ذہن اور فلسفیانہ ذہن ہمیشہ متصادم رہتے ہیں۔ اب یہ انسان کی افتاد طبع پر منحصر ہے کہ اس میں دینیاتی ذہن کا عنصر زیادہ ہے یا فلسفیانہ ذہن کا کیونکہ کوئی انسان نہ تو خالص دینیاتی ذہن رکھتا ہے اور نہ خالص فلسفیانہ دماغ۔ لیکن جس عنصر فکر کا پلہ جتنا بھاری ہوتا ہے اسی اعتبار سے آدمی کا انداز تاویل اور طرز تشریح مختلف ہوتا ہے۔

خلیفہ صاحب نے ہم لوگوں کی ذہنی تبدیلی کا کام اس قدر تدریجی اور غیر شعوری طور پر انجام دیا کہ ہم میں سے اکثر کو یہ محسوس بھی نہ ہوا کہ ہم ایک فکری انقلاب کے دور سے گزر رہے ہیں۔ خلیفہ صاحب کی اس کامیابی کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے کبھی ادعائیت اور تحکم سے کام لے کر ہم پر اپنا نقطۂ نظر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جس طرح وہ مجلسی زندگی میں مساوات اور بے تکلفی برتتے اور اپنے ملنے والوں کو کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیتے کہ وہ اپنے کو ان سے اعلیٰ تر خیال کرتے ہیں اسی طرح علمی زندگی میں بھی کبھی انہوں نے اپنی علمی برتری جتانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ہم لوگوں سے علمی مسائل پر اس طرح بحث کرتے تھے گویا ہم لوگ علم و فضل میں ان کے ہم پلہ ہیں۔ اختلاف رائے کو کشادہ دلی سے برداشت کرتے تھے اور اپنی بات پر اصرار نہیں کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ہم لوگوں نے کبھی اپنے خیالات چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ

بات ان کی علمی عظمت کا کافی ثبوت ہے کیونکہ جن لوگوں میں علم کی کمی ہوتی ہے اور فکر کی پختگی نہیں پائی جاتی وہ اپنے آپ کو تنقید سے بالاتر سمجھنے لگتے ہیں۔ اور دوسروں کو دلائل سے قائل کرنے کے بجائے اپنے شخصی رعب وداب یا معاشرتی مرتبہ سے متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خلیفہ صاحب اس نقص سے یکسر پاک تھے۔ ہمارے ملک میں خلیفہ صاحب کے پایہ کے ادیب، عالم اور مفکر اب تقریباً ناپید ہیں۔ وہ علم وادب شعروشاعری، فلسفہ اور تصوّف کے جامع تھے۔ مفکر ہی نہ تھے بلکہ مفکر گر بھی تھے۔ انہوں نے بہت سے اشخاص کے طرز فکر اور طریق استدلال کو متاثر کیا۔ اور بہت سے لوگوں کو جمود سے نکال کر حرکت پذیر بنا دیا۔ خلیفہ صاحب اپنے رفقاء اور تلامذہ کا ایک حلقہ چھوڑ گئے ہیں جن میں سے کوئی شخص بھی ان کے علمی احسان سے سبکدوش نہیں ہوسکتا۔

میری بدقسمتی تھی کہ بعض مجبوریوں کے باعث مجھے خلیفہ صاحب سے ان کے عین حیات جدا ہونا پڑا۔ لیکن علاحدگی کے بعد بھی خلیفہ صاحب کے اور میرے تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اسی محبت ومروّت سے ملتے رہے اور مجھے جو تجربات آئندہ پیش آئے اس سے ان کی قدرومنزلت میں اضافہ ہوگیا۔ شاید یہ خلیفہ صاحب سے میری گہری عقیدت وخلوص کا نتیجہ ہو کہ ان کے آخری ایام حیات میں بھی دوچار روز کے لیے میرا اور ان کا ساتھ رہا۔ کراچی میں اسلام پر ایک بین الاقوامی مباحثہ ہورہا تھا۔ سندھ یونیورسٹی کی جانب سے میں بھی کانفرنس میں ایک مندوب تھا۔ خلیفہ صاحب لاہور سے تشریف لائے۔ حسب معمول انہوں نے اسلام کی حمایت میں بڑی شگفتہ تقاریر فرمائیں۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی ان سے خوش ہوگئے جن کو ان کی راسخ العقیدگی میں شک تھا۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ وہ بہت جلد اپنے رفقاء اور شناساؤں کو داغ مفارقت دینے والے ہیں۔ غالباً چوتھے یا پانچویں روز ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے بھرے اجلاس میں ان کی وفات کی خبر سنائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خلیفہ صاحب کے مخالفین ان کو مذہب میں جدّت پسند، آزاد خیال، گمراہ اور نہ جانے کیا کیا خیال کرتے تھے۔ اس کا سبب دراصل یہ تھا کہ دینیاتی ذہن مذہبی حقائق کی جس انداز سے ترجمانی کرتا ہے وہ اس سے بہت مختلف ہے جو ایک فلسفیانہ اور متصوفانہ ذہن کی خصوصیت ہے۔ خلیفہ صاحب کائنات کی حقیقت اور حیات کی ماہیت پر فلسفیانہ انداز سے سوچتے تھے اور مذہبی عقائد کی توجیہہ بھی اسی انداز سے کرتے تھے۔ اس لیے سطحی اذہان اگر انہیں گمراہ اور بے دین سمجھیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہر وہ شخص جو جرأت فکر رکھتا ہے اور مروّجہ عقائد سے ہٹ کر سوچتا ہے مخالفین کی دشنام طرازی اور پروپگنڈے کا شکار ہوجاتا ہے۔ خواہ

حقیقت کے اعتبار سے وہ دین کا بہتر ترجمان ہو۔ بہرحال اگر دین کا تعلق رواجی اعتقادات پر نہیں بلکہ جزاو سزا اور رسالت پر ایمان سے ہو تو خلیفہ صاحب کا ایمان ان پر ویسا ہی مستحکم تھا جیسا کہ کسی پاکباز اور راسخ العقیدہ مسلمان کا ہو سکتا ہے۔ ذات رسالتمآبؐ کے ساتھ ان کی الفت و عقیدت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ رسول اللہ کی نبوت کو مثالی قرار دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ جناب رسالت مآبؐ نے نبوت کا جو اعلیٰ معیار قائم فرمادیا ہے اس کے بعد انبیائے بنی اسرائیل کی نبوت نظروں میں نہیں جچتی اور نبی آخر الزمانؐ کے مقابلہ میں وہ عارفین حق اور اولیاء کے درجہ پر فائز معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب کی نظروں میں حضورؐ کا کیا مقام تھا۔ اور وہ حضورؐ کے ساتھ کیسی والہانہ عقیدت و الفت رکھتے تھے۔ خلیفہ صاحب کو منکر حدیث بھی قرار دیا گیا ہے لیکن میں نے جتنی اعلیٰ درجہ کی احادیث خلیفہ صاحب سے سنیں اور کسی سے سننے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ خلیفہ صاحب نرے فلسفی ہیں انہیں علوم قرآن و حدیث سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بات ان کی ابتدائی زندگی کے تعلق سے صحیح ہے لیکن آخری دس بارہ سال میں خلیفہ صاحب نے قرآن و حدیث کا بڑا گہرا مطالعہ فرمایا تھا۔ اور اپنی فطری ذہانت کے باعث وہ علم حدیث کے فنی ماہر نہیں تو رمز شناس ضرور کہلائے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے بعض احادیث کی توجیہہ و تشریح میں ایسے ایسے نادر نکات پیدا کئے جن سے ہمارے قدیم علماء یکسر قاصر تھے۔ چنانچہ جواہرات پر زکوٰۃ کے بارے میں مجھے خلیفہ صاحب کی توجیہہ نہایت شاندار معلوم ہوئی۔ فرماتے تھے کہ عرب ایک مفلس قوم تھی اس لیے عربوں میں بمشکل دو ایک ایسے اشخاص ہوں گے جن کے پاس ایک آدھ ہیرا یا دوسرا قیمتی پتھر موجود ہو۔ اس لیے جب حضورؐ نے عاملین زکوٰۃ کو وصولی زکوٰۃ کے لیے روانہ فرمایا تو انہیں جواہرات پر زکوٰۃ وصول کرنے میں بڑی دقت ہوئی۔ کیونکہ اوّل تو جواہرات کی تعداد دو ایک سے زیادہ نہیں تھی۔ دوئم انہیں بازار میں فروخت بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ عرب میں ان کا شاید ہی کوئی خریدار نکلتا۔ اب دوسری صورت صرف یہ تھی کہ انہیں توڑ کر چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ لے لیا جاتا۔ مگر اس سے جواہرات تلف ہو جاتے اور ان کی قیمت وصول نہ ہوتی۔ اس لیے آپؐ نے فرمایا کہ چونکہ ایک دو اشخاص سے زیادہ کا معاملہ نہیں اس لیے ان سے جواہرات پر زکوٰۃ نہ لو۔ یہ توجیہہ نہایت معقول معلوم ہوتی ہے ورنہ یہ امر قابل غور ہے کہ اسلام نے جب سونے چاندی اور دوسرے ذخائر پر زکوٰۃ عائد کی تو ہیرے جواہرات کو کیوں مستثنیٰ قرار دیا جب کہ اس ذریعہ سے لوگ اپنی دولت کو زکوٰۃ سے بچا سکتے ہیں۔

خلیفہ صاحب نے طلاق و نکاح کے کمیشن میں جو سفارشات کی تھیں ان پر بھی ہمارے قدیم مذہبی

حلقوں میں بڑی لے دے ہوئی۔ بالخصوص تعدد ازدواج کے مسئلہ پر حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خواہ تعدد ازدواج ہو یا طلاق کا موجودہ طریقہ ان دونوں سے بہت سے مسلمان ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں جس کی وجہ سے عورتوں کے جائز حقوق متاثر ہوتے ہیں۔ اسلام نے تعددِ ازدواج کی مشروط اجازت دی تھی اور وہ بھی ناگزیر حالات کی بنا پر۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ تعددِ ازدواج کا طریقہ قطعاً مسدود کرنے کے قابل ہے کیونکہ بعض حالات ایسے پیدا ہو سکتے ہیں کہ مرد کو واقعی دوسرے یا تیسرے نکاح کی حاجت پیش آئے۔ لیکن اس استثنائی صورتِ حال کو ایک مسئلہ عام قاعدہ نہیں بنایا جا سکتا۔ سب سے بڑا سوال معاشی عدل کا ہے جس کو خود قرآن حکیم نے ایک شرط لازم قرار دیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کتنے لوگ دوسری یا تیسری شادی کرنے کے بعد اپنی پہلی بیوی کو سابقہ معیار کے مطابق خرچ دے سکتے ہیں اور کتنوں سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ پہلی بیوی سے اسی حسن سلوک سے پیش آئیں گے جیسے دوسری شادی سے قبل۔ اس لیے خلیفہ صاحب کا یہ فرمانا بالکل بجا تھا کہ تعدد ازدواج کی خاص حالات اور شرائط کے تابع دی جانی چاہیے۔ نیز طلاق کے بارے میں بھی مردوں پر بعض قیود لگانے چاہئیں تاکہ وہ اس کو محض اپنی لطف اندوزی کا ذریعہ نہ بنالیں۔

خلیفہ صاحب پر مغرب زدہ ہونے کا الزام بھی لگایا گیا۔ لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ جو لوگ مغربی تہذیب کی فلسفیانہ بنیادوں سے واقف نہیں اور جنہیں یہ نہیں معلوم کہ مغرب کی تہذیب اسلامی تہذیب سے کس درجہ متاثر ہے وہ اسلام اور مغرب کو دو متبائن تہذیبیں خیال کریں تو بے جا نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب میں اکثر امور مابہ الاشتراک ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ مغرب پر مادیت طاری ہے تو آج دنیا میں مادیت کہاں طاری نہیں؟ خود مسلمانوں کی مادیت پسندی مغرب سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ صرف اسی زمانہ میں نہیں عہد رسالت اور خلافت راشدہ سے قطع نظر کر لیجئے تو تاریخ میں اسلامی قدروں کا نشان بہت دھندلا نظر آتا ہے۔ ایسی حالت میں مغرب کے بالمقابل اپنی روحانیت کا دعویٰ کرنا کچھ زیادہ زیب نہیں دیتا۔ یہ صحیح ہے کہ مادیت ایک نظریہ اور عقیدہ کی حیثیت سے ہماری تہذیب میں بار نہیں پاسکی اور مغرب میں ملاحدہ فلسفیوں اور سائنسدانوں کا ایک بڑا گروہ موجود ہے۔ لیکن اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ موجودہ علوم و فنون کا سرمایہ تحقیقات اتنا زیادہ وسعت پذیر ہو گیا ہے کہ اس میں ہر قسم کے خیالات و عقائد کی گنجائش موجود ہے۔ دوسرے خود مغربی فلاسفہ اور سائنس دانوں میں مادیت کے خلاف ردعمل ہو رہا ہے اور وہ حیات کی روحانی بنیادوں پر زور دینے لگے ہیں۔ اس لیے کوئی تعجب نہیں کہ آئندہ پچاس یا

یا سو سال میں مغربی فلسفہ اور سائنس کی ہیئت بدل جائے لیکن جہاں تک عملی زندگی کا تعلق ہے حقیقی روحانیت تاریخ کے ہر دور میں چند پاکیزہ نفوس تک محدود رہی اور عام انسانوں کی بڑی اکثریت ہمیشہ دنیوی اور مادی اقدار کی طلب میں زندگی بسر کرتی رہی ہے خواہ اسلامی ممالک میں ہو یا مغربی ممالک میں۔ البتہ اسلامی ممالک میں اس مادیت پسندی کو مذہب کے پردے میں چھپا یا گیا۔ اور مغربی ملکوں میں مذہب کی آڑ اٹھا دی گئی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے اندر اتنی دیانتِ فکر باقی نہیں کہ ہم اپنی کمزوریوں اور خامیوں کا جائزہ لے سکیں۔

ہمارے مذہبی طبقات مغرب کی کمزوریوں اور برائیوں کو تو بہت جلد دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن کسی فرد یا تہذیب کی روحانی زندگی کے لیے یہ طرزِ فکر نہایت مضرت رساں ہے کہ وہ دوسروں کی عیب جوئی کرتا رہے اور اپنی کمزوریوں اور خامیوں سے صرف نظر کرے۔ ایک زندہ تہذیب وہ ہے جس میں محاسبۂ نفس کا عمل اجتماعی پیمانے پر بھی اسی طرح جاری ہو جس طرح شخصی زندگی میں۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی تہذیب کمزوریوں اور نقائص سے خالی نہیں اور ہم اسے بلا اخذ و ترک قبول نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ہماری اپنی تہذیب کے کچھ بنیادی تقاضے ہیں جن سے ہم اعراض نہیں کر سکتے۔ خلیفہ صاحب کا بھی یہی کہنا تھا۔ انہوں نے مغرب کی اندھی تقلید کو کبھی نہیں سراہا لیکن دیانت داری سے مغرب کے بعض پہلوؤں کی تعریف کی۔ اگر یہ دیانتِ فکر مغرب زدگی ہے تو ہم میں سے اور زیادہ اشخاص کو مغرب زدہ ہونے کی ضرورت ہے۔

فری لینڈ ۔ کے ۔ ایبٹ

خلیفہ حکیم کے مذہبی خیالات

میرے لیے یہ امر اعزاز و شرف کا موجب ہے کہ میں نے قریب قریب ایک سال کی مدت خلیفہ عبدالحکیم کی معیت میں طالبعلمانہ حیثیت سے بسر کی ہے۔ وہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے احاطۂ باغ میں اور کبھی اپنے دارالمطالعہ میں رونق افروز ہوتے تھے۔ کبھی ہنسی خوشی باتیں کرتے اور کبھی صبر آزما انہماک کے ساتھ وہ مسائل حل کرتے جو میری ذہنی تشویش کا سبب بنے ہوئے تھے۔ وہ یہ شک رفع کرنے کے لیے کہ انھوں نے کہیں کھینچ تان کر تو مطلب نہیں نکالا ہے عربی لفظ کی خوب چھان پھٹک کرتے تھے۔ وہ قرآن کریم کا عمیق مطالعہ کرتے تھے اور یہ اس لیے کہ انہیں یہ پختہ یقین تھا کہ نزولِ قرآن کا منشا ہی یہ ہے کہ اسے پڑھا جائے۔ ان کے ایمان باللہ کا تصور یہ تھا کہ اس کی ذات حدود و قیود سے ماورا ہے۔ اس کی حکمت و مؤدت کا دائرہ بھی لامحدود ہے۔ تکشف زہد کے جو ضابطے اس کی ذات سے منسوب ہیں ان سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم کو ہمیشہ اس بات کا خیال رہتا تھا کہ ان کی باتیں سمجھنے میں کہیں کسی کو کوئی الجھن تو نہیں ہے، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ان کی باتیں عقل کی کسوٹی پر پوری نہ اترتی ہوں۔ بالعموم وہ یہ فرمایا کرتے تھے "کیا یہ مسئلہ واضح نہیں ہو گیا؟" "کیا اس کا مفہوم کچھ اور بھی ہے؟" یہ وہ مستقل سوالات تھے جو قرآنی عبارات اور ان کی تصریحات سے متعلق آپ اکثر دریافت کیا کرتے تھے۔

وہ انتہا درجے کے مذہبی انسان تھے لیکن ان کا اندازِ فکر فلسفیانہ تھا۔ لفظی موشگافی سے ان کی طبع سلیم ہمیشہ ابا کرتی تھی۔ مذہب سے متعلق ان کا تصور کچھ اس انداز کا تھا کہ وہ کوئی ایسی بات گوارا نہیں کرتے تھے جس سے شانِ الوہیت و بالا نہ ہوتی ہو۔ اصول پرستی اور رسوم و قیود کے محلات میں وہ خدا کو محصور کر دینا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ حقیقی مذہب وہ ہے جس کا پیغام آفاقی ہو اور ہمیشہ ان کی نظر آفاقیات ہی پر رہتی تھی۔ وہ فرمایا کرتے کہ محض زبانی اقرار کر لینے سے قرآن حکیم کو ذکرٌ للعالمین نہیں کہا جا سکتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے ان مفاہیم و مطالب کا استقصا کیا جائے جن پر آفاقیت کی چھاپ ہو۔ اس قسم کی دریافت ہر مسلمان کے فرائض و حقوق میں داخل ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم سید احمد خاں کے مکتبِ خیال کی پیروی کرتے تھے۔ سر محمد اقبال کے کلام اور پیغام پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہ سلیم الطبع مفکر اور ایک ایسے محقق تھے جنھیں ہمیشہ حق و صداقت کی جستجو رہتی تھی۔ اس اعتبار اور اس لحاظ سے ان کی گرم جوش شخصیت کی یاد میرے ذہن اور حافظے میں تازہ رہے گی۔

محمد جعفر پھلواروی

روشن خیال مفکّر

یوں تو مرحوم خلیفہ صاحب کو آغاز تعلیم ہی سے علمی، ادبی، تحریری، تقریری اور مجلسی صلاحیتیں قدرت کیطرف سے عطا ہوئی تھیں لیکن زمانے کے ساتھ ساتھ مرحوم کی ان تمام صلاحیتوں میں ارتقا ہوتا گیا اور جب انہوں نے ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی بنیاد رکھی تو ان کی تمام صلاحیتوں کی نمود بڑی تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ ثقافتی دور کو انکی صلاحیتوں کے ارتقا کا آخری دور سمجھنا چاہیے۔ بعض اوقات انسان کے اندر بہت سے خیالات مرکوز ہوتے ہیں لیکن متعدد وجوہ سے ان کا اظہار یا تشریح نہیں ہو پاتی پھر جب مناسب موقع ہاتھ آتا ہے تو چھپی ہوئی چیزیں ابھرنے لگتی ہیں۔ مرحوم جب لاہور میں تھے تو انگریزی حکومت کا تسلط تھا۔ جب حیدر آباد میں تھے تو دن کو رات اور رات کو دن کہلوانے والا انتظام حکومت کا مسلط تھا اور جب کشمیر میں تھے تو مظلوم مسلمان اکثریت پر جبر و استبداد کی حکومت تھی۔ غرض کسی جگہ بھی انہیں وہ ماحول نہیں ملا جہاں وہ اپنے دل کی بات کھل کر کہہ سکتے۔ اپنی پرائیویٹ اور قابل اعتماد صحبتوں میں وہ بہت کچھ کہہ جاتے تھے لیکن لکھ نہیں سکتے تھے۔ ماحول کو نبھانا ضروری تھا اس لیے وہی باتیں کہیں جو خالص فلسفیانہ اور علمی و ادبی انداز کی تھیں اور جہاں صاف صاف کچھ کہنا پڑا وہاں حسین و جمیل اشاروں سے کام لیا یا لطائف کے پردے میں کہہ گئے۔

لیکن جب پاکستان وجود میں آیا اور انہیں خلاف توقع کشمیر چھوڑنا پڑا تو انہیں ایک ایسی فضا میسر آگئی جہاں انہیں اپنے دل کی بات کہنے کے مواقع ہاتھ آئے۔ اب ان پر کوئی خارجی دباؤ نہ تھا اور اس کے علاوہ ملکی و قومی تقاضوں نے بھی انہیں مجبور کر دیا کہ وہ صحیح راہنمائی میں کوئی پس و پیش نہ کریں۔ بات انسان وہیں کرتا ہے جہاں کچھ لوگ اسے توجہ سے سننے والے موجود ہوں۔ تائید یا تردید میں سنجیدہ و لطیف انداز اختیار کرتے ہوں خوش قسمتی سے ایسا ہی ماحول ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں انہیں مل گیا۔ ایک طرف آزادی فکر و ضمیر اور دوسری جانب ردّ و قبول کے لیے خوشگوار ماحول۔ ان دونوں چیزوں نے مل کر ایک ایسی فضا پیدا کر دی کہ حقائق و معارف اُبل اُبل کر باہر آنے لگے۔ اعلیٰ افکار و خیالات اچھل اچھل کر بے ساختہ پروان چڑھنے لگے۔

مرحوم خلیفہ صاحب کی طبیعت "سفرا طی" واقع ہوئی تھی۔ پڑھنا لکھنا ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا لیکن ان کی زندگی کے بہترین لمحات وہ ہوتے تھے جب اہل علم کا مجمع ہو اور وہاں کوئی علمی بحث چھڑی ہوئی ہو۔ ایسے مواقع پر مرحوم کے

ہو ہر حس طرح کھلتے تھے وہ دیکھنے کے قابل ہوتے تھے۔ سوال و جواب بھی ہو رہے ہیں۔ طنز بھی ہو رہی ہے مگر کسی ادنیٰ دل شکنی کے بغیر، لطائف بھی ہو رہے ہیں۔ پھر اشعار بھی ہیں، فلسفہ بھی ہے، تاریخ بھی ہے، حدیث بھی ہے، تفسیر بھی ہے۔ اور ہر مشہور زبان کے اقتباسات بھی ہیں۔

یوں تو وہ جہاں بھی رہے اپنے حسن مذاق کے مطابق ایک ماحول پیدا کرتے رہے لیکن جو فضا انہیں یہاں لاہور میں اور خصوصاً ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں ملی وہ کہیں میسر نہ آسکی کیونکہ یہ مجلس عین ان کی آرزوؤں کے مطابق تھی اور یہیں ان کے سقراطی ذوق کی تسکین ہوتی تھی۔ یہاں وہ کھل کر بولتے تھے اور کھل کر سنتے تھے۔ جس دن رفقائے ادارہ یا وہ اس لطف صحبت سے محروم رہ جاتے اس دن ہم دونوں ہی تشنگی سی محسوس کرتے تھے

خلیفہ صاحب کے بعض افکار کو سننے سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ان پر کئی شخصیتوں کا گہرا اثر تھا اور ان سب کے مجموعی اثرات نے مل جل کر خلیفہ صاحب کو ایک الگ نرالی شخصیت بنا دیا تھا۔ متاخرین میں وہ سرسیدؒ سے بہت متاثر تھے۔ اس کے بعد ان کے رفیق و شاگرد مولانا وحید الدین سلیمؒ سے بھی خاصے متاثر تھے۔ پھر علامہ اقبالؒ کے تو شاگرد ہی تھے اس لیے ان کا بھی خاصا اثر خلیفہ صاحب پر تھا۔ ہم یہاں ان تمام لوگوں کا ذکر نہیں کر رہے ہیں جن کے افکار کا خلیفہ صاحب پر اثر تھا۔ یہاں ہم صرف انہی تین شخصیتوں کا ذکر کر رہے ہیں جن سے خلیفہ صاحب متاثر تھے۔

اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں کہ سرسیدؒ اپنے دور کے بعید ترقی پسند علما میں تھے۔ بہت سے مسائل میں انہوں نے اپنے خیالات بے دھڑک ظاہر کیے اور اس وقت نہ یہ لحاظ کیا کہ عوام میں اس کا کیا ردعمل ہوگا اور نہ اس کی پرواہ کی کہ ہر مسئلے کو اجماعی کہنے والے علما کیا کہیں گے۔ مثلاً انہوں نے سب سے پہلے حیات مسیح کے متعلق آپنے وہ خیالات ظاہر کیے جو" اجماع امت" کے خلاف سمجھے جاتے ہیں۔ اور بعد میں انہی خیالات کا سرقہ کر کے بعض حضرات خود مسیح بھی بن گئے۔ معراج نبویؐ کو انہوں نے جس انداز سے بیان کیا وہ بھی تقریباً خلاف اجماع ہی سمجھا جاتا تھا۔ غلامی پر انہوں نے جو کچھ لکھا وہ بھی قدامت پرستوں کے نزدیک خلافِ اجماع ہی تھا۔ اسی قسم کے بہت سے افکار ہیں جن کے اظہار کے عوض سرسید آج تک قابل ملامت سمجھے جاتے ہیں۔

یہی حال مولانا وحید الدین سلیم کا تھا۔ وہ فقہ کے سارے دفتر کو نظر ثانی کا محتاج سمجھتے تھے اور فرسودہ مسائل کو بالکل رد کر دینے کے قائل تھے

اس کے بعد اقبال کا دور آیا تو انہوں نے بھی فقہ جدید کی تدوین کو وقت کی سب سے بڑی ضرورت تسلیم کیا۔ خلیفہ صاحب مرحوم کے افکار پر ان تین شخصیتوں کا جو اثر تھا وہ ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں زبان و قلم سے ظاہر ہوتا رہتا تھا۔ وہ کسی مسلک کی فقہ کو از ابتدا تا انتہا واجب التسلیم نہیں سمجھتے تھے بلکہ کہتے تھے کہ موجودہ دور کی ضرورتوں

۔اور تقاضوں کے مطابق جس مسلک کی فقہ میں کام کی بات ملے لے لینی چاہیئے اور جو حصۂ فقہ ہمارے عصری تقاضوں کو پورا نہ کرے اسے چھوڑ دینا چاہیئے۔ اپنے ان خیالات کی وجہ سے ہر مسئلے کو وہ ترقی پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے اور ترقی پسندانہ ہی حل تلاش کرتے تھے۔ جمود سے وہ بڑی بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔ ان کی ترقی پسندی محض خیالی نہ تھی بلکہ اس کا مفہوم یہ تھا کہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں عصری تقاضوں کے مطابق چلنا چاہیئے۔

عائلی و ازدواجی کمیشن کے موقع پر وہ مجھ سے خصوصیت کے ساتھ ہر مرحلے پر مشورہ کرتے تھے۔ جہاں میرے ان کے درمیان رائے کا توافق ہوتا اور میں اس کے لیے حوالے تلاش کر کے دیتا تو وہ بے حد خوش ہوتے تھے۔ کمیشن کی رپورٹ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے خیالات میں کس قدر لبرل واقع ہوئے تھے۔ اور اسی طرح اس جمود کا اندازہ کرنا بھی مشکل نہیں جو اختلافی نوٹ میں ظاہر کیا گیا ہے

فیملی پلاننگ پر میں ان سے کئی دن گفت گو کرتا رہا۔ جب میرا پورا اطمینان ہو گیا تو انہی کی فرمائش پر میں نے وہ تمام مضامین لکھے جو ادارے کی مطبوعہ "تحدید نسل" میں موجود ہیں۔

اسی طرح کمرشل انٹرسٹ پر میرے مضامین بھی انہی کی فرمائش سے شائع ہوئے۔

تعداد ازدواج پر جب انہوں نے میرے خیالات سنے تو اس موقع پر بھی انہی کی فرمائش سے میں نے اپنے مضامین قلم بند کیے جو اب کتابی شکل میں شائع ہو گئے ہیں

ان تمام چیزوں سے پہلے ایک دن غنا و موسیقی کا ذکر چھڑ گیا خلیفہ صاحب کو موسیقی سے عملی لگاؤ بالکل نہ تھا انہوں نے کہا کہ: سنا ہے آپ کو گانے سے بھی دلچسپی ہے۔ میں نے کہا: میں چشتی ہوں لیکن گانے سے میری دلچسپی چشتی ہونے سے بہت پہلے سے ہے"۔ اس کے بعد اس موضوع پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے کچھ گفت گو ہوئی تو کہنے لگے کہ: اگر گانا ہماری ثقافت میں شمار ہو سکے تو اس پر بھی ایک کتاب ہونی چاہیئے۔ میں نے کہا کہ یہ خدمت میرے سپرد کر دیجیے۔ جب میں نے "اسلام اور موسیقی" لکھی تو وہ اسے پڑھ کر بہت متاثر ہوئے چنانچہ جب ــــ عالمی سیمینار لاہور میں منعقد ہوا تو اقطار عالم کے ان تمام نمائندوں کو خلیفہ صاحب نے ادارے میں بھی مدعو کیا۔ اس موقع پر ادارے کی تمام مطبوعات کی نمائش بھی ہوئی تھی۔ خلیفہ صاحب نے انگریزی میں ادارے کے مقاصد اور کارگزاریوں کا ذکر کرتے ہوئے جب کتابوں کا تعارف کرایا تو مثال میں صرف ایک ہی کتاب کو پیش کیا اور وہ تھی "اسلام اور موسیقی"۔ (اس کے بعد پروفیسر عبدی علام نے اس تقریر کا برجستہ عربی ترجمہ کر کے عرب نمائندوں کو سنایا)

اس کے علاوہ "تشبیہات رومی" میں بھی خلیفہ صاحب نے آغاز ہی میں حاشیے پر بڑے اچھے الفاظ میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔

مرحوم خلیفہ صاحب کو میرے خیالات سن کر بڑا تعجب بھی ہوتا تھا۔ انہوں نے ایک موقع پر پوچھا کہ ایک مولوی ہونے کے باوجود یہ روشن خیالی کہاں سے آگئی؟ کسی نے کہا ندوی ہونے کی وجہ سے۔ بولے: سب ندوی تو ایسے نہیں ہوتے۔ میں نے کہا اس کا جواب دو چار دن تک عرض کروں گا کیونکہ جو کچھ میں کہوں گا اس کی زندہ شہادت بھی ہونی چاہیئے اور وہ دو چار دن تک آجائے گی۔ لیکن اگر آپ کو زبانی جواب سے تسکین ہو سکے تو میں عرض کروں بات یہ ہے کہ میں بانیِ ندوۃ العلماء (حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواروی) کا فرزند ہوں اور وہ اپنے دور کے روشن خیال عالم و صوفی تھے اور مجھ میں یہ روشن خیالی انہیں سے وراثت میں ملی ہے"۔۔۔ کچھ دنوں کے بعد میں نے حضرت ممدوح کی وہ تقریر دکھائی جو انہوں نے ندوۃ العلماء کے ابتدائی اجلاس کانپور منعقدہ ۱۳۰۲ھ میں فرمائی تھی۔ یہ تقریر سرسید نے اپنے اخبار "تہذیب الاخلاق" میں اپنے ایک نوٹ کے ساتھ شائع کی تھی۔ خلیفہ صاحب نے یہ مضمون اور سرسید کا نوٹ غور سے پڑھا اور کہا کہ اسے ضرور "ثقافت" میں شائع کیجئے۔ البتہ فلاں فلاں چیزوں کو حذف کر دیجئے کیونکہ وہ اسی دور کی چیزیں ہیں اور موجودہ دور میں ان کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ چنانچہ ان کی ہدایت کے مطابق وہ تقریر ثقافت میں بھی شائع کر دی گئی۔

غرض خلیفہ صاحب مرحوم کئی اہم شخصیتوں سے متاثر ہو کر ایک الگ ممتاز شخصیت بن گئے تھے۔ ہم نے تو صرف تین متاخرین کا ذکر کیا ہے ورنہ متقدمین میں بھی بہت سے لوگوں سے متاثر تھے۔ سقراط، رومی، غزالی، اسپینوزا، گوئٹے وغیرہ سے بھی متاثر تھے۔ یہ تاثرات مرحوم کی تصنیفات میں جا بجا ملتے ہیں۔ لیکن ایک چیز ہر تاثر میں مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ خلیفہ صاحب انہی شخصیتوں سے متاثر تھے جو لبرل ہوں اور اونچے افکار و کردار کے مالک ہوں یہی وجہ ہے کہ صوفیہ میں انہیں وہ صوفی زیادہ پسند تھے جن کی تعلیمات و تصورات میں زیادہ جکڑ بندیاں نہ ہوں۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو

اس وقت میں والد مرحوم مولانا سالک کے کتب خانے میں بیٹھا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ اپنے نہایت ہی شفیق بزرگ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے بارے میں اپنے تاثرات کا آغاز کہاں سے کروں۔ وہ میرے دوست نہیں تھے، میرے باپ کے دوست تھے لیکن ان کی شخصیت اتنی پیاری تھی کہ جو اُن سے چند لمحے بات کر لیتا ان کا گرویدہ ہو جاتا اور ان کی عظمت کا کمال یہ تھا کہ جو شخص ان کے آستانے پر حاضری دیتا اُس سے یوں ملتے جیسے وہ سچ مچ ان کا دوست ہو۔ خواہ وہ شخص کتنا ہی ادنےٰ کیوں نہ ہو۔ تصور کیجئے ایک طرف خلیفہ عبدالحکیم، ایک عظیم فلسفی، اسلامی مسائل کے ہر پہلو سے آگاہ، ماہر تعلیمات، اعلیٰ پائے کا ادیب، نقاد اور شاعر، اور دوسری طرف راقم الحروف۔ ایک اخبار نویس اور صحافت کا معمولی معلم اس وسیع بُعد کے باوجود انہوں نے کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں ذہنی طور پر ان سے کہیں کمتر ہوں۔ یقیناً اس میں یہ حقیقت بھی کارفرما ہوگی کہ میں اُن کے دوست کا فرزند تھا۔ لیکن میں نے انہیں اوروں سے بھی گفتگو کرتے دیکھا ہے اور ان کے کردار میں یہ چیز نمایاں پائی ہے کہ وہ امتیازِ مراتب کے اتنے زیادہ قائل نہیں تھے۔

والد مرحوم کہتے تھے میرے نزدیک دو شخص ایسے ہیں جو گفتگو کے بادشاہ ہیں اور محفل آرائی میں کمال رکھتے ہیں۔ ایک حکیم احمد شجاع، دوسرے خلیفہ عبدالحکیم۔ لیکن دونوں کی گفتگو کے انداز میں فرق ہے۔ اول الذکر ہمیشہ سنجیدہ رہتے ہیں اور اپنی گفتگو سے بعض اوقات حاضرین پر رقت کا تاثر چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے برعکس خلیفہ عبدالحکیم کی گفتگو سے محفل کی محفل لوٹ پوٹ ہو جاتی ہے اور ایسے ایسے لطیفے ہو جاتے ہیں جو مدتوں تک ذہن میں آ آکر ہونٹوں کو مسکرانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ راقم الحروف کو یاد ہے ایک دفعہ برطانوی ڈپٹی ہائی کمشنر کی ایک دعوت میں خلیفہ صاحب بھی مدعو تھے۔ میں سلام کو آگے بڑھا تو فرمانے لگے۔ کارٹون چھپوا دیا نا؟ میں تھوڑی سی دیر الجھن میں رہا کہ وہ کس کارٹون کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ دو لمحوں میں سمجھ گیا کہ ان کی مراد "پاکستان ٹائمز" کے اس کارٹون سے ہے جو پنجاب یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر میاں افضل حسین صاحب کی تعلیمی پالیسی پر طنز کے لیے بنایا گیا تھا اور اس کی بنیاد میاں صاحب کا وہ بیان تھا جس میں انہوں نے اعلیٰ تعلیم کو صرف ذہین طلبہ تک محدود کرنے کا نظریہ پیش کیا تھا۔ میں نے فوراً کہا "کارٹون مجھے چھپوانے کی کیا ضرورت تھی، میاں صاحب بات ہی اس انداز

سے کرتے ہیں کہ کارٹونسٹ لیک کرآتا ہے اور چند آڑے ترچھے خطوط کی مدد سے اس کا مذاق اڑا دیتا ہے۔ کہنے لگے ان کے بیان کے بارے میں تمہاری ذاتی رائے کیا ہے؟" میں نے کہا" چھوٹا منہ بڑی بات۔ آپ کے سامنے میں اپنی رائے کیسے پیش کروں"۔ انہوں نے نہایت پیار سے کاندھے پر ہاتھ رکھا" نہیں! نہیں! تم ضرور بتاؤ۔ میں نے سنا ہے تم ان کے بڑے حامی ہو"۔ میں نے قدرے حجاب کے ساتھ کہا" اُن کی باتوں کو اگر دلیل کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو نہایت وزنی اور کھری معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ــــ لیکن وہ غالباً یہ نہیں جانتے کہ ان غیر معمولی نظریات کو "گروہ در گروہ" پیش نہیں کرنا چاہیئے۔ پہلے ایک نظریہ پیش کریں اور جب تک لوگ اسے اچھی طرح ہضم نہ کر لیں دوسرا نظریہ سامنے نہ لائیں، اور پھر جو بات کہیں اگر یہ ڈر ہو کہ لوگوں کو کڑوی لگے گی تو اس پر شکر کا خول چڑھا دیں۔ اس سے ان کی عظمت میں کمی نہ ہوگی، اضافہ ہی ہوگا"۔ اس پر خلیفہ صاحب ہنسنے لگے اور فرمایا" بھئی میرا خیال بھی یہی ہے کہ میاں صاحب کے تعلیمی نظریات صحت مند ہیں لیکن ان کا حال اس باپ کی طرح ہے جس کا ایک جوان بیٹا تھا۔ اس نے سوچا لڑکے کا رشتہ کر دوں۔ چنانچہ ادھر ادھر گھومنے لگا۔ کبھی ایک سے بات کی کبھی دوسرے سے لیکن اسے نہ صرف ہر جگہ مایوسی کا سامنا ہوتا بلکہ کہیں کہیں پٹائی بھی ہو جاتی۔ آخر اس نے اپنے ایک دوست سے فریاد کی کہ ہر شخص لڑکے والوں کی قدر کرتا ہے لیکن میری پٹائی ہو جاتی ہے حالانکہ میرا لڑکا پڑھا لکھا ہے۔ صاحب جائیداد ہے اور برسرِ روزگار ہے بھلا اس سے بہتر رشتہ کیا ہوگا۔ دوست نے پوچھا۔ جب تم کسی لڑکی والے کے پاس جاتے ہو تو کیا کہتے ہو۔ اس نے کہا بھلا یہ بھی پوچھنے کی بات ہے۔ بات بالکل سیدھی ہے۔ میں کہتا ہوں۔ تمہاری لڑکی جوان ہے۔ ہمارا لڑکا جوان ہے اور ازل سے ابد تک یہی رسم چلی آتی ہے کہ جوان لڑکی اور جوان لڑکے کے ملاپ سے دنیا قائم ہے۔ اس سیدھی سادی بات سے لڑکی کے باپ کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے اور وہ مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دیتا ہے۔ تم ہی بتاؤ۔ آخر کیوں؟ میں نے کیا قصور کیا ہے؟ اب دوست کو معلوم ہوا کہ پٹائی کیوں ہوتی ہے۔ اس نے کہا تمہاری نیت کا قصور نہیں۔ صرف بات کا ڈھنگ غلط ہے۔ اب کسی لڑکی کے باپ کے پاس جاؤ تو پہلے ادھر ادھر کی اچھی اچھی باتیں کرو۔ پھر باتوں ہی باتوں میں اپنے لڑکے کی تعلیم، جائیداد اور ملازمت کا ذکر کر دو۔ اس کے بعد چلے آؤ۔ پھر دوسری ملاقات میں اسی طرح کی تمہید باندھو۔ اور بڑے ادب سے کہو کہ میرے فرزند کو اگر آپ اپنی فرزندی میں لے لیں تو میرے لیے یہ سرمایۂ فخر و امتیاز ہوگا۔ یہ فرما کر خلیفہ صاحب کہنے لگے۔ بس میاں صاحب کو یہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے۔

لاہور میں تو خلیفہ صاحب سے چند ملاقاتیں ہوئیں اور وہ بھی ان کی زندگی کے آخری دنوں میں۔ لیکن مری میں چونکہ مال روڈ سب کی ملاقات کا اڈہ ہے۔ اس لیے وہاں ان سے سرراہے کئی بار ملاقات ہوتی تھی اور ہمیشہ ایک آدھ لطیفہ ہو جاتا تھا۔ مری کی ادبی اور ثقافتی زندگی کے وہ دولہا تھے۔ مری لٹریری یونین جب "لن ٹاٹ" رستوران

میں کوئی خصوصی تقریب منعقد کرتی تو خلیفہ صاحب ضرور مدعو ہوتے اور اپنی شخصیت کے حسن اور کشش سے ساری محفل پر چھا جاتے اور لطائف و ظرائف کا ایک دریا تھا کہ مسلسل بہا جاتا تھا۔ انہی محفلوں میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ اعلیٰ پائے کے شاعر بھی ہیں۔ بیاض لے آتے تھے اور سنانے پر آتے تو احباب کی فرمائش پر غزلیں اور طویل نظمیں پڑھتے۔ اور حاضرین کی پیاس تھی کہ مٹنے میں نہ آتی تھی۔

وفات سے تقریباً ایک مہینہ پہلے ایک نجی کام کے سلسلے میں ان کے دولتکدے پر گیا۔ بات لمبی ہو گئی اور میں نے سگرٹ پینا چاہا۔ (بزرگوں کے سامنے سگرٹ پینے میں میں مضائقہ نہیں سمجھتا کہ والد صاحب کے سامنے بھی ایسا کوئی حجاب نہیں تھا) لیکن میں نے دیدہ و دانستہ سگرٹ کیس نہ نکالا۔ وجہ یہ تھی کہ میں قینچی کا سگرٹ پینے کا عادی تھا اور ہوں۔ لیکن میں نے سوچا۔ اگر ان کے سامنے سگرٹ کیس کھولا۔ تو انہیں بھی سگرٹ پیش کرنا ہو گا اور وہ تو اسٹیٹ ایکسپریس پیتے ہوں گے۔ ایسے میں قینچی کا سگرٹ پیش کرنا زیادتی ہو گی۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ انہوں نے اپنی جیب سے قینچی کی ڈبیا نکالی اور سگرٹ سلگا کر پینے لگے۔ اس سے میرا حجاب ٹوٹ گیا اور میں نے بھی اپنا سگرٹ سلگا لیا۔ بعد میں والد صاحب سے معلوم ہوا کہ خلیفہ صاحب مستقل طور پر اسی سگرٹ کے عادی ہیں۔

ان کی زندگی میں سے صرف چند دن باقی تھے کہ مجھے ان سے ایک ادبی کام کے سلسلے میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ اُن دنوں والد صاحب بیماریٔ قلب کے ایک شدید حملے سے بچ گئے تھے۔ خلیفہ صاحب ہمیشہ پہلے ان کا حال پوچھتے۔ اس دفعہ بھی ان کا حال پوچھا۔ اور پھر کہنے لگے ان کی عمر کیا ہو گی؟ میں نے کہا چونسٹھ برس۔ تو ہنس کر کہنے لگے کہ بھئی اب اتنی عمر میں تو ایسے عوارض لاحق ہوتے ہی ہیں۔ اب تو ہم لوگوں کا چل چلاؤ ہے۔ اور کسے معلوم تھا کہ یہ سرخ و سفید چہرہ جو عمر کی پختگی کے باوجود جوانوں سے بہتر نظر آتا تھا۔ چند روز بعد اپنی تمام مسکراہٹوں، لطیفوں اور شگفتگیوں کو لے کر وہاں چلا جائے گا۔ جہاں پہنچ کر کوئی نہیں لوٹتا۔

خلیفہ صاحب کی شخصیت کے پہلو بے شمار ہیں۔ اُن کے علم و فضل سے ایک دنیا نے فائدہ اٹھایا۔ دینی مسائل سے ان کی آگہی نے بے شمار ایسے نوجوانوں اور بڑے بڑے پڑھے لکھوں کو اپنے دین کے قریب کر دیا جن کے ذہن بہلے ہوئے تھے اور خیالات متزلزل تھے۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی بنیاد رکھ کر انہوں نے ایک ایسا سلسلہ جاری کر دیا جس سے ہمارا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ذہنی طور پر اسلام کے زیادہ قریب آ رہا ہے۔ آخری عمر کی بے پناہ محنت کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمارے پاس ان کی زندگی بھر کے حاصل کئے ہوئے علم کا نچوڑ موجود ہے۔ لیکن ان کی یہ ساری خدمات ایسی ہیں جن کا صحیح اندازہ عالم و فاضل شخصیتیں ہی کر سکتی ہیں۔ میں اس کے سوا کیا کر سکتا ہوں کہ عقیدت کے پھول پیش کر دوں۔

محمد وارث کامل

پہلی اور آخری ملاقات

عرصے سے یہ تمنا دل میں چٹکیاں لے رہی تھی کہ اس مفکرِ اسلام سے ایک دو بار ضرور ملوں جس نے عمر بھر حکمت و ثقافت کے جام و مینا میں مشرق و مغرب کے خم خانوں کی کشید کی ہوئی شراب انڈیلی ہے۔ میرے ایک عزیز دوست مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی نے ایک دن یہ مژدۂ جاں بخش سنایا کہ:

خلیفہ صاحب آجکل لاہور میں ہیں اور روزانہ بلاناغہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں ان کا نزول اجلال ہوتا ہے، آپ ان سے ملنا چاہیں تو بڑے شوق تشریف لائیں لیکن وقت کی پابندی کا خیال ضرور رہے خلیفہ صاحب ۱۱ بجے سے ۲ بجے تک مل سکتے ہیں۔

اگلے دن شوقِ ملاقات کشاں کشاں مجھے کلب روڈ لے گیا، گیارہ بجنے میں کچھ ہی منٹ باقی تھے نرسنگداس گارڈنز کے وسیع و عریض احاطے کے ایک گوشے میں ادارہ کے کچھ رفقا کرسیوں پر پرے جمائے بیٹھے تھے میں بھی رسمی علیک سلیک کے بعد ایک خالی کرسی پر براجمان ہوگیا۔ ابھی رفقائے ادارہ سے میں کوئی بات بھی نہیں کرپایا تھا کہ ایک چھوٹے سائز کی کار احاطے کے ایک سرے پر آکر رکی رفقائے ادارہ برقی سرعت کے ساتھ سروقد اپنی اپنی جگہ چپ چاپ کھڑے ہوگئے میں نے بھی ان کی تقلید کی۔ کار سے اچھے خاصے حجم و ضخامت کا ایک صحیفہ انسانیت برآمد ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس آرام کرسی پر جو پہلے ہی سے وسط میں بچھی ہوئی تھی ایک ایسی شخصیت سے پہلی بار آنکھیں چار ہوئیں جس کے چہرے بشرے سے شگفتگی ٹپکتی تھی۔ مولانا جعفر شاہ پھلواروی نے چپکے سے میرے کان میں کہا:

خلیفہ صاحب یہی تو ہیں، تعارف کے لیے کسی تمہید کی ضرورت نہیں، کچھ اپنی کہو اور کچھ ان کی سنو۔

خلیفہ صاحب ٹھہرے نباضِ فطرت، بات چیت میں خود ہی پہل کی، فرمایا، آپ کی تعریف؟ رفقائے ادارہ میں سے کسی صاحب نے تعارف کا خوش گوار فرض ادا کیا، چونکہ برسبیلِ تذکرہ میرے شعری ذوق اور ترجمہ کی صلاحیتوں کی جانب بھی اشارہ کیا گیا تھا اس لیے خلیفہ صاحب کی فرمائش اور رفقائے ادارہ کے اصرار پر مجھے اپنی ایک طویل نظم سنانی پڑی۔ یہ نظم ولیم ورڈس ورتھ کی ایک انگریزی نظم کا ترجمہ تھا۔ موصوف نے غالباً میری حوصلہ افزائی کی خاطر نظم پر اظہارِ تحسین کیا، مجھے یاد پڑتا ہے آپ نے ایک مصرع میں تھوڑی سی ترمیم بھی فرمائی تھی۔

اپنے مخصوص انداز میں خلیفہ صاحب مختلف موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے گویا ایک دبستان معرفت کھلا ہوا تھا۔ کبھی کبھی آپ گفت گو کے دوران کسی نہ کسی رفیق سے کوئی علمی سوال بھی کر بیٹھتے تھے۔ باتوں باتوں میں یہ موضوع چھڑ گیا کہ انگریزی سے اردو میں ترجمے کے لیے بعض اوقات مناسب الفاظ نہیں ملتے۔ کسی صاحب نے کہا، خلیفہ صاحب اب تو کتب لغات کی کثرت نے یہ عقدہ حل کر دیا ہے۔ الفاظ تو الفاظ، اصطلاحات کے ترجمے بھی مل جاتے ہیں۔ خلیفہ صاحب نے فرمایا، اگر یہ بات ہے تو آپ ہی سے کوئی صاحب فرمائیں کہ ORTHODOX کا ترجمہ اُردو میں کیا ہوگا۔ غالباً کسی مصلحت سے رفقائے ادارہ نے اس سوال کا رُخ میری جانب پھیر دیا میں نے کچھ تامّل کے بعد عرض کیا کہ اس کا مناسب ترجمہ راسخ العقیدہ ہو سکتا ہے۔ خلیفہ صاحب نے ترجمہ کی صحت میں تو کلام نہیں کیا البتہ یہ بات فرمائی کہ یہ ترجمہ اتنا ثقیل ہے کہ ذہن اس کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا، سیدھا سادہ ترجمہ کیجئے۔ اس پر میں نے اردو کا ٹھیٹھ لفظ "کٹر" تجویز کیا تو خلیفہ صاحب کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی اور آپ نے ایک بھرپور قہقہہ سر کیا۔ میں نے عرض کیا کہ اُردو زبان نے رسوخ و راسخ کے الفاظ نہ اپنائے ہوتے تو ہم ORTHODOXY اور ORTHODOX کے لیے یہ الفاظ بڑی بے تکلفی کے ساتھ استعمال کر سکتے تھے۔ اس پر خلیفہ صاحب اور ان کے رفقا نے جنبش سر و دوش پر اکتفا کیا جس کے معنیٰ یہ تھے کہ ہمیں صحیح اور مناسب الفاظ کی نایابی کا شدت سے احساس ہے۔

لاہور کے ادبا، شعرا، اور علما کا ذکر چھڑا تو خلیفہ صاحب نے بڑے لطیف انداز میں فرمایا، اس دور میں ارباب کمال کا قحط ہے، ایک صاحب جو ماشاء اللہ کہنے کو ایم اے پی ایچ ڈی تھے مجھ سے ملے اور کہا کہ:

خلیفہ صاحب میں بھی آپ کے ادارہ میں ایک رکن کی حیثیت سے علمی خدمات پیش کرنی چاہتا ہوں کیا آپ مجھے اس کے لیے موقع عنایت فرمائیں گے

میں نے ان کی بات سنی اور صاف لفظوں میں یہ کہا کہ:

آپ نے اس سے پہلے اگر کوئی علمی خدمت سرانجام دی ہے تو اس کا کوئی تحریری ثبوت دیجئے یا کوئی نیا مضمون لکھ لائیے تاکہ میں یہ جائزہ لے سکوں کہ آپ کی خدمات کس حد تک ادارہ کے لیے مفید ہو سکتی ہیں۔

وہ صاحب کچھ دنوں کی غیر حاضری کے بعد پھر تشریف لائے لیکن تھے تہی دست۔ تہی دستی کا عذر یہ پیش کیا کہ بیروزگاری کے سبب دماغ حاضر نہیں ہے اس لیے کچھ نہیں لکھ سکا۔ آپ مجھے اپنے ادارہ میں شامل کر لیجئے پھر دیکھئے میرا اشہب خامہ کیسی کیسی جولانیاں دکھاتا ہے۔

میں نے اُن صاحب سے یہ بات کہی کہ:

جناب والا! اگر آپ کی جگہ میں ہوتا اور ملازمت موقوف ہوتی صرف چند صفحات لکھنے پر تو میں آپ

کو یقین دلاتا ہوں کہ میں پچاس صفحے لکھ لانا معلوم ہوتا ہے کہ آپ سند یافتہ ایم اے پی ایچ ڈی تو ہیں لیکن پختہ مشق انشا پرداز نہیں نظر آتے۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ کچھ عرصے تک کچھ نہ کچھ لکھنے کی مشق بہم پہنچائیں وہ صاحب ایسے گئے کہ پھر انہوں نے اپنی صورت نہیں دکھائی۔ اس دور کے ادبا، شعرا اور علما کی تصویر بھی اس آئینے میں دیکھیے۔ مجھے تو اس صحرا میں کوئی قیس نظر نہیں آتا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ:

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار

صحرا مگر بہ تنگیٔ چشم حسود تھا

موضوع گفت گو پھر بدلا اور یہ بات چل نکلی کہ آیا نام محض تعارف کے لیے ہوتے ہیں یا ان کی تہ میں کوئی اور معنوی حقیقت بھی مضمر ہے۔ میں نے گفت گو کے لیے موقع غنیمت جانا اور یہ بات کہی کہ اگر سب نہیں تو بعض نام ضرور ایسے ہوتے ہیں جن کی معنوی حقیقت کا اطلاق ان شخصیتوں پر بھی ہوتا ہے جن سے یہ نام منسوب ہیں۔ مثلاً دور نہ جائیے خلیفہ صاحب کے نام پر ایک اصافی نظر ڈالیے کہ یہاں اسم اور مسمّیٰ میں ہم آہنگی نہیں ہے۔ آپ عبدالحکیم اسماً بھی ہیں معناً بھی۔ خلیفہ صاحب کی ذات زیر بحث آئی تو صرف اتنا فرمایا کہ حکیم تو کوئی اور ہے میں تو محض عبد ہوں اس پر موقع کی مناسبت سے میں نے کسی کا یہ فارسی شعر پڑھ دیا

گرچہ خوردیم نسبتے ست بزرگ

ذرۂ آفتاب تابانیم

دو بجا ہی چاہتے تھے اور خلیفہ صاحب کو کچھ دفتری کاغذات پر دستخط کرنے تھے اس لیے آپ تھوڑی دیر کے لیے کھو گئے۔ اس دفتری سرخ فیتے سے فراغت کے بعد آپ نے سر اٹھایا، مسکرائے اور خراماں خراماں اپنی کار کی جانب بڑھے۔ سب سے باری باری مصافحہ کے بعد اگلی نشست پر بیٹھے اور عقبی نشست پر میں اور ایک دوسرے صاحب جم کر بیٹھ گئے لطف کی بات یہ ہے کہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ کا یہ ڈائرکٹر اپنی کار میں ڈرائیوری کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ کار زنانے بھرتی چلی جارہی تھی اور خلیفہ صاحب۔ تھ کہ موٹر چلانے کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی موضوع پر ایک آدھ فقرہ بھی فرماتے تھے۔ ریگل سینما کے قریب جب کار پہنچی تو خلیفہ صاحب کی زبان پر یہ فقرہ تھا:

مولانا آپ نے بی اے کا امتحان کس سنہ میں پاس کیا تھا؟

میں نے جواب میں عرض کیا، ۱۹۳۷ء میں جسے آج ۲۱ سال ہوتے ہیں۔ خلیفہ صاحب نے فرمایا "صرف" ہمیں تو یہ منزل طے کیے ہوئے نصف صدی گزر چکی ہے۔ ملاقات کا سلسلہ اسی فقرہ پر ختم ہوا —— میں کار سے اترا، اور خلیفہ صاحب کی کار پلک جھپکتے میں نگاہوں سے اوجھل ہوگئی —— دل میں یہ حسرت ہی رہ گئی کہ ملاقات کا سلسلہ کچھ اور دراز ہوتا۔ لیکن یہ حسرت بعد میں بھی نہ نکل سکی اور وہ اس لیے کہ خلیفہ صاحب ہی دنیا سے سدھار گئے۔

مطبوعات ادارۂ ثقافت اسلامیہ

اسلام کا معاشی نظریہ

مصنفہ محمد مظہرالدین صدیقی

١/١٢ روپے

•

افکار غزالی

مصنفہ محمد حنیف ندوی

٨/٨ روپے

•

کمرشل انٹرسٹ

مصنفہ محمد جعفر شاہ ندوی

١/٨ روپیہ

•

قرآن اور علم جدید

مصنفہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین

٦/٨ روپے

•

حیات محمد

مترجمہ ابو یحییٰ امام خان

٢٢/٨ روپے

اسلام کا نظریۂ تاریخ

مصنفہ محمد مظہرالدین صدیقی

٣/٨ روپے

•

تجدید نسل

مصنفہ محمد جعفر شاہ ندوی

١٢ آنے

•

اسلام میں حیثیت نسواں

مصنفہ محمد مظہرالدین صدیقی

٣/٨ روپے

•

مسئلۂ تعدد ازدواج

مصنفہ محمد جعفر شاہ ندوی

١/١٢ روپے

•

سیاست شرعیہ

مصنفہ رئیس احمد جعفری

٥/- روپے

اجتہادی مسائل

مصنفہ محمد جعفر شاہ ندوی

٣/٨ روپے

— اپنے مقامی تاجر کتب سے حاصل کریں یا براہ راست ادارہ کو لکھیں —

سیکرٹری **ادارۂ ثقافت اسلامیہ** - کلب روڈ ، لاہور